مسلسل اشاعت کے 60 سال

محرم الحرام ۱۴۴۸ھ
جون ۲۰۲۶ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- حقیقتِ عمل صالح از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری!
- روحِ قربانی اور اُمت کی نشاۃ ثانیہ: کیسے؟
- اسلام، جمہوریت اور پاکستان
- مشرقِ وسطیٰ کا بحران اور پاکستان کا امتحان
- مفتی طارق مسعود اور شجاع الدین شیخ کا مکالمہ

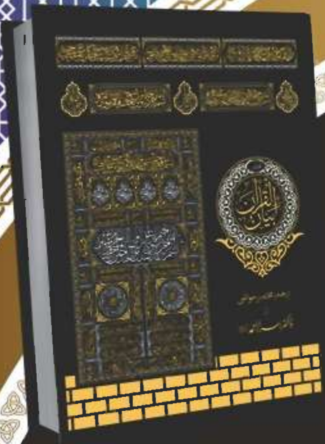


داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت

کے بعد اب پیش ہے:

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

## مختصر بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

- مضبوط جلد
- دیدہ زیب ٹائٹل
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1500 روپے

**مکتبہ خُدّام القرآن لاہور**

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“


| | | |
|---|---|---|
| جلد | : | 75 |
| شمارہ | : | 6 |
| محرم الحرام | | 1448ھ |
| جون | | 2026ء |
| فی شمارہ | : | 60 روپے |
| سالانہ زرِتعاون | : | 600 روپے |


# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


مُدیر مسئول
شجاع الدین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت
○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا
○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران
○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد



مکتبہ خدام القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700

فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212

ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

# مشمولات


**عرضِ احوال** — 5

روحِ قربانی اور اُمّت کی نشأۃ ثانیہ: کیسے؟ — رضاءالحق

**تذکرہ و تبصرہ** — 10

مشرقِ وسطیٰ کا بحران اور پاکستان کا امتحان — شجاع الدین شیخ

**درسِ قرآن** — 13

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**ابوظبی سیریز** — 37

حقیقتِ عملِ صالح — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**گفتگو** — 56

مفتی طارق مسعود اور شجاع الدین شیخ کا مکالمہ — مجلہ الشریعہ

**منبر و محراب** — 65

دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری! — شجاع الدین شیخ

**ظروف و احوال** — 77

اسلام، جمہوریت اور پاکستان — ایوب بیگ مرزا

**حقوق و فرائض** — 88

اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق — احمد علی محمودی

**انوارِ ہدایت** — 95

توکّل کی صحیح تعبیر — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ


''ادارہ'' کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# روحِ قربانی اور اُمّت کی نشأۃِ ثانیہ: کیسے؟

جون کا مہینہ اِس سال بھی اُمّتِ مُسلمہ کے لیے کئی گہرے سوالات کے ساتھ آ رہا ہے۔ دنیا بھر کی توجہ امریکہ اور اسرائیل کی زیادتیوں پر ہے۔ پاکستانی عوام انتظار کر رہے ہیں کہ حکومت اس مہینے سالانہ بجٹ کے نام پر مزید کون کون سے نئے ٹیکس لگائے گی اور انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ادا کرنا پڑیں گے۔ گھر کا بجٹ کیسے پورا ہوگا؟ چند روز پہلے ہی لاکھوں مسلمانوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ دنیا بھر کے کروڑوں مسلمانوں نے سُنّتِ ابراہیمی علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانوروں کی قربانی پیش کی‘ تکبیرات کی صدائیں فضا میں بلند ہوئیں اور شاید ایثار و بندگی کے جذبات تازہ ہوئے ہوں۔ حج و قربانی کے اِن ایام میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اسلام کے یہ ارکین و شعائر صرف رسمی عبادات بن کر رہ گئے ہیں یا ان کی حقیقی روح بھی ہماری اجتماعی زندگی میں اُتر رہی ہے؟ یہی وہ بنیادی وجوہری سوال ہے جو آج پوری اُمّت کو درپیش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قربانی کا اصل فلسفہ محض جانور ذبح کرنا نہیں بلکہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت‘ ایثار اور اپنی محبوب ترین شے کو اللہ کی رضا کے لیے قربان کرنے کے جذبے کو بیدار کرنا ہے۔ سُنّتِ ابراہیمؑ دراصل بندۂ مؤمن کو یہ سبق دیتی ہے کہ جب اللہ کا حکم آ جائے تو انسان اپنی خواہشات‘ مفادات اور جذبات کو اس کے دین کے تابع کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ قربانی کی عبادت اُمّتِ مُسلمہ کو جہاد‘ اقامتِ دین اور دین کی سربلندی کے لیے ہر قسم کی قربانی پر تیار کرنے کی ایک عملی تربیت ہے۔ قربانی اگر صرف رسم بن کر رہ جائے اور انسان کی زندگی میں اطاعت‘ تقویٰ اور دین کے لیے ایثار پیدا نہ کرے تو اس کی حقیقی روح ہی فوت ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی سُنّت بھی ہمیں یہی درس دیتی ہے کہ اللہ کی

رضا کے سامنے سب کچھ قربان کر دیا جائے۔ تاریخِ اسلام کا ہر روشن باب اِسی جذبۂ قربانی سے عبارت ہے۔ بدر سے اندلس تک‘ خلافتِ راشدہ سے تحریکِ آزادیٔ پاکستان تک‘ اُمّت نے جب بھی ایثار‘ صبر اور جِدّ وجُہد کا راستہ اختیار کیا تو اللہ نے اُسے عزت و غلبہ عطا فرمایا۔ آج اُمّتِ مُسلمہ کی اجتماعی زندگی اِس روح سے بڑی حد تک خالی دکھائی دیتی ہے۔ صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ ہماری انفرادی عبادات میں شاذ ہی سہی‘ جوش تو دکھائی دیتا ہے مگر اجتماعی معاملات میں کمزوری‘ خوف اور مصلحتیں حد سے زیادہ غالب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان ظلم و ستم کا شکار ہیں اور اُن کی آواز مؤثر قوت میں تبدیل نہیں ہو پا رہی۔ اِس تناظر میں سب سے نمایاں اور دردناک منظر غزہ کا ہے۔ فلسطین کے نہتے مسلمان گزشتہ کم و بیش ڈھائی سال سے جس ظلم‘ محاصرے اور نسل کشی کا سامنا کر رہے ہیں‘ وہ جدید دنیا کے ضمیر پر بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ معصوم بچوں‘ خواتین اور بوڑھوں کی شہادتیں‘ تباہ حال بستیاں‘ بھوک اور بے گھری‘ یہ سب کیا اہلِ فلسطین کا ہی مسئلہ ہے؟ کیا ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں؟ ’’بورڈ آف پیس‘‘ کا مقصد کیا صرف فلسطین خصوصاً غزہ کے مسلمانوں کو ہی ’’پیسنا‘‘ ہے؟

ہمارے نزدیک یہ پوری اُمّتِ مُسلمہ کے اجتماعی ضمیر کا امتحان ہے۔ غزہ کے مظلوم مسلمانوں نے قربانی کی حقیقی روح کو زندہ کر رکھا ہے۔ انہوں نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ ایمان‘ صبر اور استقامت کیا ہوتا ہے۔ محدود وسائل کے باوجود اُن کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ اُن کے گھروں کو ملبے میں بدلا گیا مگر اُن کے عزم کو شکست نہیں دی جا سکی۔ اِس کے برعکس مسلم دنیا کی سیاسی قیادت کا بڑا حصہ بے بسی‘ بے حسی‘ مصلحت یا خاموشی کا شکار نظر آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی ادارے بھی انصاف فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اُن جیسوں کے ’’انسانی حقوق‘‘ کے بلند بانگ دعوے کھوکھلے ثابت ہو چکے ہیں۔ غزہ کا بحران صرف ایک جنگ نہیں بلکہ یہ موجودہ عالمی نظام کے اخلاقی دیوالیہ پن کو بے نقاب کر رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ جب تک فکری‘ تہذیبی اور سیاسی طور پر متحد نہیں ہوگی‘ اِس کے مسائل محض قراردادوں اور بیانات سے حل نہیں ہوں گے۔

ضرورت اِس امر کی ہے کہ اُمّت اپنے اصل مرکز یعنی قرآن و سُنّتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کرے‘ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرے اور محض جذباتی ردِّعمل کے بجائے منظم

انقلابی جدّ وجہد کا راستہ اختیار کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا تصوّرِ ’’عروجِ ثانی‘‘ غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو بارہا اِس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ اُمّتِ مُسلمہ کا زوال محض سیاسی یا عسکری شکست کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآن سے دوری، دینی شعور کی کمزوری اور اجتماعی نظم کے فقدان کا انجام ہے۔

اُن کے نزدیک اسلام کی نشأۃِ ثانیہ محض مروجہ معنوں میں سیاسی تبدیلی یا مسلمانوں کے دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ گیر دینی وفکری انقلاب کا عمل ہے، جس کی بنیاد ایمان کی تجدید، قرآن سے عملی تعلق اور کسی دینی اجتماعیت کے ساتھ جُڑ کر منہجِ نبوی ﷺ کی بنیاد پر منظم جِدّ وجُہد ہے۔ وہ بارہا کہتے تھے کہ اُمّتِ مُسلمہ کا زوال اُس وقت شروع ہوا جب قرآن زندگی کے مرکز سے ہٹ گیا اور دین محض چند عقائد، عبادات اور رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اُن کے نزدیک احیائے اسلام کا آغاز فرد کے اندر ایمان کی حرارت پیدا کرنے، پھر ایک صالح اور منظم جماعت کی تشکیل، اور بالآخر اقامتِ دین کی اجتماعی جِدّ وجہد سے ہوگا۔ وہ اِس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ جیسے عہدِ نبوی ﷺ میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ایک انقلابی جِدّ وجہد کے ذریعے اسلامی نظام قائم ہوا تھا، ویسے ہی آج بھی صبر، تقویٰ، قربانی، دعوت اور اقامتِ دین کی جِدّ وجُہد کے مراحل سے گزر کر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دوبارہ ظہور ممکن ہے۔

اللہ کی محبت بھی اپنے بندوں کے لیے نقطۂ عروج کو تب ہی پہنچتی ہے جب بندوں کی اپنے ربّ کے لیے محبت نقطہ عروج پر نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ’’بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اُن لوگوں سے جو لڑتے ہیں اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔‘‘ (الصف: ۴)

دوسری طرف اللہ سے اُن کی محبت کا مطالبہ ان الفاظ میں آتا ہے کہ:

> ’’اور ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔‘‘ (البقرۃ: ۱۶۵)

پھر سورۃ المجادلہ میں فرمایا:

> ’’تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں یا اُن کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں

جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ اور وہ اُن کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو! اللہ کی جماعت والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (آیت: ۲۲)

سورۃ المائدۃ میں ایسے ایمان وتقویٰ والوں کے بارے میں فرمایا:

''اور جو اللہ اور اُس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنائے تو (اسے معلوم ہو کہ) یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔'' (آیت: ۵۶)

اللہ کی جماعت (حزب اللہ) میں شمولیت کے لیے اِن اوصاف کی اہمیت اس حقیقت سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حقیقی طور پر اللہ کی جماعت میں شامل کسی فرد میں یہ مطلوبہ اوصاف نہ ہوں تو اُسے حقیقی ایمان کے حصول کے لیے ابھی بہت محنت کرنا ہوگی۔

امریکی صدر ٹرمپ کا بھاری بھر کم تجارتی اور حکومتی شخصیات کے ساتھ دورۂ چین جاری ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق چین کے صدر اور دیگر اعلیٰ عہدیداران نے امریکہ کو وارننگ دی ہے کہ تائیوان کے معاملے پر اگر امریکہ نے کوئی چھیڑ چھاڑ کی تو چین جنگ کرنے سے نہیں کترائے گا۔ میڈیا میں امریکی صدر کا یہ بیان بھی سامنے آیا ہے کہ چین نے آبنائے ہرمز کو کھلوانے میں مدد کی پیشکش کی ہے۔ ہمارے نزدیک خطے میں جنگ اور بدامنی پیدا کرنے کا ظاہری ذمہ دار تو امریکہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسرائیل ''گریٹر اسرائیل'' کے اپنے ابلیسی منصوبے کو جلد از جلد آگے بڑھانے کے لیے امریکہ کے ذریعے جنگ کے شعلے بھڑکا رہا ہے۔ عالمی طاقتوں کے اِس کھیل میں نقصان صرف مسلم ممالک کا ہو رہا ہے۔ امریکہ کو اپنے ملکی مفادات سے زیادہ ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل کے مفادات عزیز ہیں۔ دوسری طرف چین سرمایہ اور تجارت کو عالمی قوت بننے کے لیے استعمال کرتا ہے اور اُسے ایران، پاکستان یا عرب ممالک سے زیادہ دنیا میں اپنی اجارہ داری عزیز ہے، جس کے لیے وہ کسی نوع کا بھی سمجھوتا کر سکتا ہے۔ دوسری طرف مغربی کنارے کے حوالے سے میڈیا میں آنے والی اطلاعات کہ اسرائیل فلسطین کے اِس علاقہ پر بھی باقاعدہ قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے، انتہائی تشویش ناک

ہیں۔ درحقیقت اسرائیل مسجدِ اقصیٰ کو (معاذ اللہ!) شہید کر کے اُس کی جگہ تھرڈ ٹیمپل کی تعمیر کی تیاری کر رہا ہے اور ہمارے نزدیک یہ معاملہ بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مسلم ممالک کے حکمران دشمن کی چالوں کا صحیح ادراک کر کے آپس میں متحد ہوں تاکہ طاغوتی قوتوں کے مذموم مقاصد کو خاک میں ملایا جا سکے؟

حکومتِ پاکستان سے ہماری خصوصی اپیل ہے کہ ایک سرحدی دشمن کو شکست دینے کی یاد میں عوام کے اربوں روپے برباد کر کے یادگار تعمیر کرنے کی بجائے ملک کو حقیقی معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی طرف توجہ دیں تاکہ مستقبل میں وطنِ عزیز عالمِ اسلام کی امامت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے دشمن کے خلاف معرکوں میں ہراول دستہ کا کردار ادا کر سکے۔ البتہ اِس حوالے سے دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ آج غزہ کے حالات‘ عالمِ اسلام کی بے سمتی اور عالمی طاقتوں کی بدلتی صف بندیاں اِس اَمر کی متقاضی ہیں کہ مسلمان وقتی نعروں اور جذباتی وابستگیوں سے نکل کر آگے بڑھیں۔ قربانی کی روح اگر واقعی زندہ ہو جائے اور اللہ کی جماعت (حزب اللہ) میں شامل ہونے کا جذبہ دل میں جاگزیں ہو جائے تو اُمّت اپنے مفادات‘ تعصّبات اور خوف کو اللہ کے دین کے تابع کر دے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی جذبہ اُمّت کو دوبارہ عزّت و وقار کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کے عروجِ ثانی کا خواب محض ایک رومانوی تصور نہیں بلکہ ایک دینی وعدہ اور احادیثِ مبارکہ کے مطابق ''تقدیرِ مبرم'' ہے۔ البتہ اِس کے لیے قربانی بھی درکار ہے‘ بصیرت بھی‘ تنظیم بھی اور مسلسل جِدّوجُہد بھی۔

اللہ تعالیٰ اُمّتِ مُسلمہ کو یہ اہم ترین دینی ذمہ داری ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!


## ماہنامہ ''میثاق'' لاہور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

### صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

**یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!**

# مشرقِ وسطیٰ کا بحران اور پاکستان کا امتحان

شجاع الدین شیخ' امیر تنظیم اسلامی

مشرقِ وسطیٰ ایک عرصے سے آگ اور خون کی لپیٹ میں ہے۔ امریکہ' اسرائیل اور ایران کی جنگ نے پورے خطے کو شدید اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جنگ اور امن کے درمیان حدِ فاصل مسلسل دھندلا رہی ہے اور دنیا ایک ایسے بحران کے دہانے پر کھڑی دکھائی دیتی ہے جس کے اثرات صرف چند ممالک تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ پوری انسانیت کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ ایسے نازک مرحلے میں پاکستان کے لیے یہ صورتِ حال ایک کڑا امتحان بھی ہے' اور ایک بہترین موقع بھی۔ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور ایسا موقع فراہم کر دیا ہے کہ پاکستان ایک مؤثر ثالث اور مصالحت کنندہ کے طور پر سامنے آئے۔

اس پورے بحران میں آبنائے ہرمز کی حیثیت مرکزی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ محض ایک بحری گزرگاہ نہیں بلکہ عالمی معیشت کی شہ رگ ہے۔ یہاں اگر کشیدگی ہے تو اس کے اثرات تیل کی منڈیوں سے دنیا کی اقتصادیات تک محسوس کیے جاتے ہیں۔ امریکہ کا طرزِ عمل ابتدا ہی سے شکوک پیدا کرنے والا رہا ہے۔ ایک طرف سخت بیانات تو دوسری طرف بحری نقل و حرکت' عسکری نگرانی اور اب بحری ناکابندی' یہ سب اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ واشنگٹن کی حکمت عملی وقتی ردِعمل نہیں بلکہ پیشگی منصوبہ بندی پر مبنی ہے۔

ایران نے جنگ بندی کے بعد خیرسگالی کے طور پر آبنائے ہرمز کھولنے کا اعلان کیا' مگر عملی صورتِ حال اس کے برعکس رہی۔ امریکی بحری سرگرمیوں کے تسلسل نے واضح کر دیا کہ باہمی اعتماد کی فضا قائم نہیں ہو سکی۔ اسی لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جنگ بندی حقیقی امن کی تمہید ہے یا صرف وقتی دباؤ کا نتیجہ؟ یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ کسی ایک فریق سے مکمل یک طرفہ عمل کی توقع غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ اگر کسی جانب سے محدود نوعیت کی خلاف ورزیاں ہوں تو انہیں سفارتی ذرائع سے حل کیا جا سکتا ہے' لیکن طاقت کے بل پر معاملات کو سلجھانے کی

کوشش ہمیشہ مزید فساد کو جنم دیتی ہے۔ امریکہ کی جانب سے دباؤ میں اضافہ مذاکراتی عمل کی روح کے منافی محسوس ہوتا ہے اور مذاکرات کے ظاہری تعطل کا باعث بھی بنا ہوا ہے۔ ادھر غزہ اور لبنان مسلسل ظلم وستم کا شکار ہیں۔ اسرائیلی جارحیت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنگ بندیوں کا دائرہ محدود رکھا جا رہا ہے اور پورے خطے میں امن قائم کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں مفقود ہیں۔ ایران کا یہ مطالبہ کہ جنگ بندی مستقل اور پورے میدانِ جنگ پر نافذ ہونی چاہیے' اصولی طور پر درست ہے' مگر بدقسمتی سے اسے مطالبے کو پذیرائی نہ مل سکی۔

صدر ٹرمپ کے بیانات میں تضاد اور عدم تسلسل نے اس بحران کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ کبھی مذاکرات کی بات' کبھی دھمکیوں کی زبان' کبھی نئی شرائط' یہ طرزِ عمل اعتماد سازی کے بجائے بداعتمادی کو جنم دیتا ہے۔ ایک عالمی طاقت کے سربراہ سے وقار' تدبر اور ذِمہ داری کی توقع کی جاتی ہے' مگر جب قیادت غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرے تو عالمی امن خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس سے بھی اہم اس جنگ کے اصل ماسٹر مائنڈ اسرائیل کا گریٹر اسرائیل کے قیام کا منصوبہ جنگ بندی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ان حالات میں پاکستان کا کردار نہایت اہم ہو جاتا ہے۔ پاکستان ایران کے ساتھ تاریخی' جغرافیائی اور ثقافتی روابط رکھتا ہے' جبکہ عالمِ اسلام میں بھی اس کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اس لیے پاکستان ثالثی کے لیے موزوں ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ تاہم صرف مذاکرات کی میز سجانا کافی نہیں' بلکہ فعال' باوقار اور اصولی سفارت کاری ناگزیر ہے۔ اگر ثالث محض سہولت کار بن جائے اور طاقتور فریق کے دباؤ کو چیلنج نہ کرے تو اُس کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔ پاکستان کو واضح انداز میں یہ باور کرانا ہوگا کہ یک طرفہ دباؤ' عسکری جارحیت اور طاقت کی سیاست پائیدار امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

ایران کے جوہری پروگرام کے حوالے سے بھی دوہرا معیار نمایاں ہے۔ اگر بعض ممالک کو وسیع عسکری قوت اور جوہری صلاحیت رکھنے کی آزادی حاصل ہے تو دوسروں کے لیے دفاعی حق کیوں مشکوک بنا دیا جاتا ہے؟ یوکرین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ بین الاقوامی ضمانتیں ہمیشہ حقیقی تحفظ فراہم نہیں کرتیں۔ لہٰذا ہر ریاست اپنے دفاع کے حق کو اہم سمجھتی ہے۔ پاکستان کے لیے بھی یہ سبق نہایت اہم ہے کہ قومی سلامتی' عسکری قوت اور داخلی استحکام پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔

ان تمام حالات میں مسلم دنیا کے لیے اصل سبق اتحاد‘ خود اعتمادی اور باہمی تعاون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان ممالک منتشر‘ کمزور اور بیرونی قوتوں کے محتاج رہیں گے‘ اُن کے مسائل دوسروں کے ایجنڈے اور مفادات کے مطابق ہی حل ہوتے رہیں گے۔ پاکستان سمیت ہر مسلم ملک کو نظریاتی‘ سیاسی‘ معاشی اور عسکری سطح پر مضبوط ہونا ہوگا۔ عالمی سیاست کے تناظر میں یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا دفاع کا حق صرف چند طاقت ور ممالک تک محدود ہے؟ اگر کچھ ریاستیں وسیع پیمانے پر ہر طرح کا اسلحہ رکھ سکتی ہیں‘ تو دیگر ممالک کو اپنے دفاع کے لیے اقدامات سے کیوں روکا جائے؟ یوکرین کئی سال سے اپنی اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

ایران کے معاملے میں بھی یہی بحث سامنے آتی ہے۔ اگر اس پر یہ دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے دفاعی یا جوہری پروگرام کو مکمل طور پر ترک کر دے‘ تو یہ اس کے لیے یک طرفہ کمزوری اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔ اسی تناظر میں پاکستان کے لیے بھی یہ سوال اہم ہے کہ کیا وہ اپنے دفاعی حق سے دستبردار ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! حقیقت یہ ہے کہ موجودہ عالمی نظام میں طاقت کا توازن ہی بقا کی ضمانت بنتا ہے۔ اِن تمام حالات میں مسلم دنیا کے اتحاد اور باہمی تعاون کی ضرورت مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر ملک‘ خصوصاً پاکستان کو نظریاتی سطح پر بہت زیادہ مضبوط ہونا ہوگا۔ معیشت میں اونچ نیچ تو وقت کے ساتھ ساتھ ہوتے رہنا گوارا کیا جاسکتا ہے مگر نظریہ سے انحراف ہوگا تو حقیقت میں کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ سوویت یونین کا نظریہ ختم ہوا تو وہ ملک بھی ختم ہوگیا۔

جنگ کسی مسئلے کا مستقل حل نہیں اور وقتی جنگ بندیوں سے کشیدگی کم ضرور ہوسکتی ہے‘ مگر اصل ضرورت ایک جامع‘ منصفانہ اور دیرپا حل کی ہے‘ جس میں تمام فریقوں کے تحفظات کو دیانت داری سے سنا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بعض اوقات بظاہر مشکل اور ناموافق معاہدے بھی مستقبل میں عظیم خیر کا سبب بنتے ہیں۔

# سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۸)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**آیت ۲۲** اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ’’جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا‘ اور آسمان سے پانی برسایا‘ پھر اُس (پانی) کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ تو ہرگز اللہ کے مدِمقابل نہ ٹھہراؤ جانتے‘ بوجھتے۔‘‘

## اللہ تعالیٰ کی خلاّقیت کے چار جامع مظاہر

یہ ’’اَلَّذِیۡ...‘‘ گویا ’’اَلَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ‘‘ کا بدل ہے۔ فرمایا: ﴿اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا﴾ ’’(تمہارا وہی ربّ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا) اُسی نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔‘‘ ﴿وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً﴾ ’’اور آسمان کو ایک چھت (کی مانند) بنایا‘‘ ﴿وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ ’’اور اُتارا آسمان (بلندی) سے پانی‘‘ ﴿فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ﴾ ’’پھر نکالا اس کے ذریعے سے میووں کی شکل میں تمہارے لیے رزق۔‘‘

یہ جو چار مظاہر بیان ہوئے ہیں‘ یہ ایک خلاصہ ہے‘ وگرنہ مکی سورتوں میں تو مظاہرِ فطرت (phenomena of the nature) بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً:

﴿اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ﴿۷﴾ وَّ خَلَقۡنٰکُمۡ اَزۡوَاجًا ﴿۸﴾ وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّ جَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾﴾ (النبا)

’’کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا ؟ اور پہاڑوں کو میخیں؟ اور ہم نے تمہیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ اور تمہاری نیند کو بنا دیا ہم نے تھکان دور کرنے والی۔ اور رات کو ہم نے بنا دیا ڈھانپ لینے والی۔ اور دن کو ہم نے بنا دیا معاش (کی جِدّوجُہد) کے لیے۔‘‘

﴿اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحۡيَآءً وَّ اَمۡوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾﴾ (المرسلات)

’’کیا ہم نے زمین کو نہیں بنا دیا سمیٹ لینے والی؟ زندوں کو بھی اور مُردوں کو بھی! اور ہم نے اس کے اندر بنا دیے خوب جمے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ‘ اور ہم نے تمہیں پلایا (اس میں سے) تسکین بخش پانی۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور خلاّقیت کی مثالیں‘ اُس کی نشانیاں اور اُس کی شانیں کائنات کے ایک ایک ذرّے میں موجود ہیں‘ لیکن یہاں زیرِ مطالعہ آیت میں بڑی خوبصورتی سے جو چار مظاہر بیان ہوئے ہیں‘ ان میں بڑی جامعیت ہے۔

زمین کو بنا دیا تمہارے لیے ایک فرش‘ بہترین بچھونا‘ ماں کی گود کی مانند حیات بخش۔ جیسے ماں کی گود حیات کے لیے گہوارہ ہے ایسے ہی نہ صرف انسانی زندگی کے لیے‘ بلکہ حیواناتی اور نباتاتی زندگی یعنی کُل حیاتِ ارضی کے لیے یہ زمین ماں کی گود کے مانند ہے۔

اس کے بعد آسمان (سَماء) چھت کی مانند ہے۔ یہاں آسمان سے کیا مراد ہے؟ ’’سمو‘‘ بلندی کو کہتے ہیں اور ’’سماء‘‘ بلندی کی کوئی شے۔ اس سے آگے قرآن مجید نے آسمانوں کی حقیقت کے بارے میں تفصیل سے کچھ بیان نہیں کیا۔ آسمانوں کے ساتھ ’’سبع‘‘ (سات) کا لفظ بار بار آیا ہے اور یہاں اس رکوع میں بھی آئے گا‘ لیکن اس کی بھی کوئی وضاحت قرآن مجید میں نہیں ہے۔ ابھی تک ہمارا علمِ فلکیات (Astronomy) بھی یہاں تک نہیں پہنچا کہ ہم حتمی طور پر یہ کہہ سکیں کہ ’’سماء‘‘ سے کیا مراد ہے اور ’’سبع سماوات‘‘ سے کیا مراد ہے! جیسے جیسے یہ علم آگے بڑھے گا‘ ان شاء اللہ‘ یہ حقیقتیں منکشف ہوتی چلی جائیں گی۔ البتہ یہ انسان کا مشاہدہ ہے‘ جیسے کہ سورۃ الغاشیہ میں آیا ہے:

﴿اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾

وَ اِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ ﴿۲۰﴾

’’تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ انہیں کیسے بنایا گیا ہے! اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے! اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں! اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) زمین کی طرف کہ کیسے بچھا دی گئی ہے!‘‘

اہلِ عرب جب حجاز میں سفر کرتے تھے تو ان کا مشاہدہ ہوتا تھا کہ اِدھر بھی پہاڑ ہیں‘ اُدھر بھی پہاڑ ہیں‘ درمیان میں راستے بنے ہوئے ہیں‘ وادیاں ہیں۔ اوپر آسمان ہے‘ نیچے زمین ہے۔ اونٹوں پر سوار چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کے مشاہدے میں مسلسل یہی چار چیزیں ہوتی تھیں: اونٹ‘ جس پر وہ سوار ہے۔ اوپر آسمان ہے۔ دائیں بائیں پہاڑ ہیں جمے ہوئے‘ اور نیچے زمین ہے۔ اسی طور سے یہاں پر چار چیزیں آئی ہیں۔ یہ انسان کا بڑا گہرا مشاہدہ ہے۔ زمین پستی کی اور آسمان بلندی کی علامت ہے۔ ایک پستی کی انتہا ہے اور ایک بلندی کی۔ یہ دونوں چیزیں بظاہر متضاد ہیں‘ ایک دوسرے کی ضد ہیں‘ لیکن اِن دونوں میں موافقت ہے۔ یہ موافقت توحید کی دلیل ہے۔ آسمان سے پانی برستا ہے‘ جو زمین میں سے نباتات کو نکال کر لاتا ہے۔ یہ ان دونوں کا انٹرایکشن ہے: ﴿وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ ’’اور اُتارا آسمان (بلندی) سے پانی‘‘ ﴿فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ﴾ ’’پھر نکالا اس کے ذریعے سے میووں کی شکل میں تمہارے لیے روزی کا سامان۔‘‘ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو تعداد کے اعتبار سے کم از کم الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے لیے انسان کی immediate observation ہے۔ جیسا کہ تعارفِ قرآن کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ قرآن کا انداز منطقی اور فلسفیانہ نہیں بلکہ بڑا فطری استدلال ہے۔ قرآن مجید اپنے استدلال کا سارا تانا بانا سب کے سامنے ظاہر حقائق سے تیار کرتا ہے۔

اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس دنیا میں جو فسادِ تمدن ہے‘ اِفراط وتفریط کے جو دھکے ہیں‘ اگر تم اللہ کی بندگی اختیار نہیں کرو گے‘ اپنی عقل کی پیروی کرو گے‘ اپنے نفس کی بندگی کرو گے تو تصادم ہوگا‘ مفادات ٹکرائیں گے‘ طبقاتی کشمکش ہوگی۔ ایک طرف حاکم اور محکوم

کے درمیان رسّہ کشی ہوگی‘ ایک طرف سرمائے اور محنت کے درمیان اور ایک طرف فرد اور اجتماعیت کے درمیان کھینچ تان ہوگی۔ یہ گویا اِفراط و تفریط کے دھکے نوعِ انسانی کا مقدر بنے رہیں گے اور تمدنِ انسانی فساد کی آماج گاہ بنا رہے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بندگی ہی میں خیر کا‘ خیریت کا‘ بھلائی کا‘ امن اور سکون کا پیغام ہے۔ اس دنیا میں ’’اصلاح‘‘ جسے کہتے ہیں‘ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا﴾ (الاعراف: ۵۶) ’’اور زمین میں فساد مت مچاؤ اس کی اصلاح کے بعد‘‘ وہ اصلاح اسی شکل میں ہوگی کہ سب کے سب ہمہ تن اللہ کی بندگی اختیار کر لیں‘ اُسی کے مطیع و فرماں بردار بن جائیں‘ اُسی کے احکام پر چلیں اور اُسی کی ہدایت کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں۔

## شرک فی الذّات اور شرک فی الصّفات کی نفی

زیرِ مطالعہ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ’’تو ہرگز اللہ کے مدِمقابل نہ ٹھہراؤ جانتے بوجھتے۔‘‘ اَنۡدَادًا جمع ہے نِدّ کی۔ دین کی نظریاتی اساس ’’توحید‘‘ ہے‘ اور توحید کا عملی پہلو اِن الفاظ میں بیان ہو چکا: ﴿اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ﴾۔ یہ توحیدِ عملی ہے کہ بندگی‘ اطاعت‘ پرستش صرف اللہ کی‘ اُس کے سوا کسی کی نہیں۔ ﴿اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ﴾ (بنی اسرائیل: ۲۳) ’’کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی مت کرو!‘‘ ﴿وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (القصص: ۸۸) ’’اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو!‘‘ جب کہ یہاں توحیدِ علمی‘ توحیدِ نظری اور توحید فی العقیدہ کا بیان ہے کہ اللہ کا مدِمقابل کسی کو نہ ٹھہراؤ! اُس کا کوئی ساجھی نہیں‘ کوئی شریک نہیں۔ اُسی کا اختیارِ مطلق ہے‘ اُسی کی قدرتِ کاملہ ہے جس کا یہ سارا ظہور ہے۔ کوئی اُس کا ہمسر یا مدِمقابل نہیں ہے۔

نِدّ کہتے ہیں کوئی ایسی ہستی جو کسی کے ہمسر ہو‘ ہم پلّہ ہو‘ مدِّمقابل ہو۔ چنانچہ ہمارے ہاں خطبات میں بعض علماء کرام ان الفاظ کی تکرار کرتے ہیں: فَلَا ضِدَّ لَهُ وَ لَا نِدَّ لَهُ وَلَا مِثۡلَ لَهُ وَلَا مِثَالَ لَهُ وَلَا مَثِیۡلَ لَهُ ! ضد اور نِد گویا ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ نِدّ وہ ہے کہ جو صرف ہمسر ہو‘ جب کہ ضد وہ ہے جو کسی کے مدِّمقابل آجائے‘

ہمسر ہو اور پھر اس سے بھی مقابلہ کرے۔ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ یہاں فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو ہمسر نہ بنادیں! یہ توحید ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات میں‘ اُس کی صفات میں‘ کسی بھی اعتبار سے‘ کسی بھی پہلو سے کسی کو اُس جیسا یا اُس کا ہمسر یا اس کا ہم پلّہ یا اُس کا ہم رتبہ نہ بنادیا جائے۔

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ شرک کی کون کون سی اقسام ہیں۔ شرک فی الذات کیا ہے؟ شرک فی الصفات کیا ہے؟ جہاں تک شرک فی الحقوق یعنی شرک عملی اور توحیدِ عملی کا تعلق ہے وہ تو اس رکوع کی پہلی آیت میں بیان ہو چکا۔ توحیدِ عملی کا اثبات یعنی شرکِ عملی کی نفی آ گئی۔ جیسے کہ سورۃ الکہف کی آخری آیت میں فرمایا گیا:

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًـا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ مَیں تو بس تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں‘ مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ پس جو کوئی بھی اُمید رکھتا ہو اپنے رب سے ملاقات کی تو اُسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔‘‘

﴿فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا﴾ یہ عقیدہ کی توحید ہے کہ کسی ہستی کو‘ کسی شے کو‘ کسی شخصیت کو‘ کسی ذات کو‘ ملائکہ میں سے‘ جِنّات میں سے‘ انسانوں میں سے‘ اولیاء اللہ میں سے یا انبیاء و رُسل میں سے‘ کسی کو کسی بھی اعتبار سے اللہ کا مثل‘ مثال‘ مثیل‘ مشابہ اور اس کی ضد یا ند نہ بنالیا جائے۔ [’’حقیقت واقسامِ شرک‘‘ کے موضوع پر میرے چھ تفصیلی خطبات ہیں۔ الحمد للہ وہ کافی معروف بھی ہوئے‘ مقبول بھی ہوئے۔ ان لیکچرز پر مشتمل کتاب ’’حقیقت واقسامِ شرک‘‘ کے عنوان سے موجود ہے۔]

اس مقام پر شرک فی الذات اور شرک فی الصفات دونوں کی نفی آئی ہے۔ شرک فی الذات یہ ہے کہ کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دینا۔ دنیا میں ضد اور ند کی دو شکلیں ممکن ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ رفیع سے گرا کر کہیں مخلوقات کی صف میں لا کے کھڑا کر

دیا جائے‘ یا مخلوق میں سے کسی کو اُٹھا کر اسے کسی اعتبار سے اللہ کے برابر کر دیا جائے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ’’یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔‘‘ اس لیے کہ ظلم کی تعریف ہی یہ ہے: وضع الشیء فی غیر محلہ یعنی کسی شے کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دینا۔ اللہ ربّ العزت کا وہ مقامِ رفیع اور اس کی یکتائیت جو بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمۡ یَلِدۡ ۬ۙ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ﴿۳﴾ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ٪﴿۴﴾﴾

’’کہہ دیجیے وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب کا مرجع ہے۔ نہ اُس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور کوئی بھی اُس کا کفو نہیں ہے۔‘‘

اُسے اس مقام سے گرا کر کسی بھی اعتبار سے کسی پہلو سے مخلوق میں سے کسی کے مشابہ کر دینا‘ یا مخلوق میں سے کسی کو اٹھا کر اس کو کسی بھی اعتبار سے کسی بھی پہلو سے اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور ضد یا ند بنا دینا‘ یہ دونوں بدترین ظلم ہیں۔

لفظ ’’نِدّ‘‘ احادیث میں بھی آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰہِ نِدًّا وَھُوَ خَلَقَکَ))[1] ’’یہ کہ تُو اُس کا کوئی مدِّمقابل ٹھہرائے حالانکہ اُس نے تجھے پیدا کیا ہے۔‘‘ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کسی درجے میں کوئی شریک یا مدِّمقابل نہیں ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّت کو اِس درجے توحید کی باریکیوں تک پہنچا کر گئے ہیں کہ ایسے تصورات کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور ایک صحابی کی زبان سے ایسے ہی رواروی میں نکل گیا: مَا شَاءَ اللّٰہُ وَمَا شِئْتَ! ’’جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب تفسیر القرآن‘ باب قولہ تعالیٰ: ﴿فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب کون الشرک اقبح الذنوب... الخ۔

نے فوراً ٹوک دیا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا؟ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ))[1] ’’کیا تم نے مجھے اللہ کا مدِّمقابل بنا دیا ہے؟ (بلکہ وہی ہوگا) جو تنہا اللہ چاہے۔‘‘ ظاہر بات ہے کہ ان صحابی کی یہ مراد نہیں ہو سکتی تھی لیکن الفاظ ایسے تھے کہ ایک شائبہ پیدا ہوا جس پر حضور ﷺ نے ٹوک دیا۔ آپ ﷺ نے اس قدر احتیاط کا عالم ملحوظ رکھا کہ اس طرح تم نے مشیت میں اللہ تعالیٰ اور مجھے بریکٹ کر دیا! مشیت تو صرف اللہ کی چلتی ہے‘ اور ہر کسی کی مشیت اللہ کے تابع ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ؕ﴾ (الدھر: ۳۱) ’’تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔‘‘ اور جیسے کہ فرمایا گیا:

﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾﴾ (القصص)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ چاہیں‘ بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے‘ اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو۔‘‘

معلوم ہوا یہ توحید فی المشیت ہے۔ مشیت تو صرف ایک اللہ کی ہے۔ ہم اپنی مشیت کو اللہ کی مشیت میں گم کر دیں‘ ہماری کوئی پسند ہی نہ رہے‘ یہ دوسری بات ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے وہی ہماری پسند بن جائے۔ یہ ہماری روحانی ترقی کا ایک مقام ہوگا۔ لیکن ضد اور ند کے اندر اس اعتبار سے اتنی باریک بینی ہے کہ جہاں کہیں ذرا سا بھی مغالطہ کا امکان پیدا ہو سکتا تھا تو حضور ﷺ نے بڑے اہتمام سے اس کا بھی سدِّباب کر دیا۔

## وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کے دو مفہوم

یہاں آیت کے آخر میں جو الفاظ آئے ہیں: ﴿وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ’’دراں حالیکہ تم جانتے ہو!‘‘ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک مفہوم جو عام طور پر لیا گیا ہے وہ تو یہ ہے کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ آسمان سے پانی برسانے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں‘ زمین اور

(۱) ان الفاظ میں یہ حدیث علامہ محمد بن عبدالوہاب نے ’’کتاب التوحید‘‘ میں نسائی کے حوالے سے درج کی ہے۔ مسند احمد میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((اَجَعَلْتَنِیْ وَاللّٰہَ عَدْلًا؟)) ’’کیا تم نے مجھے اور اللہ کو برابر کر دیا؟‘‘ (مرتب)

آسمان کو پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ یہ حقائق تمہیں معلوم ہیں! لیکن تاویلِ خاص کی طرف رجوع کریں تو مشرکینِ عرب کا شرک اس نوعیت کا نہیں تھا کہ وہ تخلیقِ کائنات میں اللہ کے ساتھ کسی کو ساجھی سمجھتے ہوں' یا انتظامِ کائنات میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک سمجھتے ہوں۔ ان کا شرک اس نوعیت کا تھا کہ کچھ ہستیاں ہیں جو مقرّبین بارگاہِ الٰہی ہیں۔ وہ اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں' اُن کی سفارش کام دے جائے گی: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس:۱۸) یہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں' ہمارے سفارش کرنے والے ہیں' ان کے ذریعے سے ہم اللہ کا تقرّب حاصل کر سکتے ہیں: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر:۳) ہم ان کی جو بھی پرستش کرتے ہیں' ڈنڈوت کرتے ہیں' سجدے کرتے ہیں' چڑھاوے چڑھاتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ یہ چونکہ اللہ کے قریب تر ہیں تو ہم ان کے ذریعے سے اللہ سے قریب ہو جائیں گے۔ ان کا شرک یہ تھا۔

شرک کی اور قسمیں بھی دنیا میں رائج ہیں۔ مثلاً ایک تصور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ہستیوں کو تقسیم کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔ یہ جو دیوی اور دیوتاؤں (gods and godesses) کا تصور ہے اس میں یہ پہلو بھی شامل ہے' لیکن جن کو عرب الٰہ بنائے بیٹھے تھے وہ صرف اس اعتبار سے کہ یہ اللہ کے چہیتے لوگ ہیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے جو بُت تھے وہ بھی درحقیقت پرانے گزرے ہوئے بہت نیک' عابد و زاہد' اولیاء اللہ کے ناموں پر بنائے گئے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی۔ چنانچہ اس اعتبار سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے: ﴿وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ کہ تم خوب جانتے ہو کہ آسمان کا پیدا کرنے والا' زمین کا بنانے والا' آسمان سے بارش برسانے والا' اور زمین سے نباتات کی صورت میں تمہارے لیے ہر طرح کا رزق برآمد کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

میرے نزدیک اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ توحید اور شرک کے معاملے میں یقیناً جلی (واضح) اور خفی (پوشیدہ) کے مابین بہت سے shades ہیں' بہت براڈ سپکٹرم ہے۔ ان الفاظ میں گویا اپیل ہے کہ کم سے کم شرک جلی سے تو بچو! جہاں تمہارا شعور کام کر رہا ہو' تمہارا

فہم‘ تمہاری سوچ‘ تمہارا ارادہ‘ تمہاری اپنی چوائس کام کر رہی ہو وہاں تو کسی کو اللہ کا مدِمقابل نہ بناؤ۔ بسا اوقات انسان تحت الشعور میں‘ بے شعوری کی کیفیت میں بلاسوچے سمجھے‘ جانے بوجھے بھی اللہ کا مدِمقابل بنا بیٹھتا ہے‘ جس کو ہم ”ریا کاری“ کہتے ہیں۔ اسے حدیث میں ”شرکِ خفی“ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلشِّرْکُ الْخَفِیُّ ان یَقُومَ الرَّجُلُ یُصَلِّیْ فَیُزَیِّنُ صَلَاتَہٗ لِمَا یَرٰی مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ)) (سنن ابن ماجہ:۴۲۰۴)

”یہ شرکِ خفی ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر نماز پڑھے اور کسی شخص کو اپنی طرف دیکھتا ہوا محسوس کرے تو اپنی نماز کو اور سنوار لے۔“

ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور جب اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس نے سجدہ لمبا کر دیا۔ اگرچہ یہ اس کا شعوری فیصلہ نہیں‘ اُس نے یہ حرکت سوچ سمجھ کر نہیں کی کہ میں اِس شخص کو دکھانا چاہتا ہوں اور اس پر اپنے زہد‘ تقویٰ اور دین داری کا رعب گانٹھنا چاہتا ہوں‘ لیکن یہ بھی شرک ہے۔ یہ شرکِ خفی ہے‘ اس لیے کہ اس ایک سجدے کے دو مسجود ہو گئے۔ ایک تو اللہ جس کے لیے وہ سجدہ کر رہا تھا‘ لیکن اُس نے اپنے سجدے میں اگر دو سیکنڈ کا بھی اضافہ کر دیا تو اس میں دوسرا مسجودِ معنوی گویا وہ شخص ہے جس کی خاطر اُس نے اپنے سجدے کو طول دیا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے فرمایا تھا: ((لَلشِّرْکُ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ))[1] ”یقیناً شرک تو چیونٹی کے رینگنے سے بھی

(۱) حدیث کا مکمل متن اور ترجمہ:

عن مَعْقِلَ بْنَ يَسَارٍ، يَقُولُ: انْطَلَقْتُ مَعَ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: ((يَا أَبَا بَكْرٍ، لَلشِّرْكُ فِيكُمْ أَخْفَى مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ))، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: وَهَلِ الشِّرْكُ إِلا مَنْ جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَلشِّرْكُ أَخْفَى مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ، أَلا أَدُلُّكَ عَلَى شَيْءٍ إِذَا قُلْتَهُ ذَهَبَ عَنْكَ قَلِيلُهُ وَكَثِيرُهُ؟)) قَالَ: ((قُلِ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ، ◄

زیادہ پوشیدہ طریقے سے داخل ہو جاتا ہے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''اَنْدَاد'' کی تعریف ''شرکاء'' سے کی ہے' اور شرک کا شکار ہونے کی مثال یہ بیان کی ہے کہ یہ تاریک شب میں سیاہ پتھر پر سیاہ چیونٹی کی چال سے بھی مخفی ہے۔ چنانچہ ﴿وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ ﴿۲۲﴾ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جانتے بوجھتے تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔

البتہ یہ نوٹ کر لیجیے کہ اس دور کا جتنا بھی شرک ہے وہ سارا شعوری شرک ہے' اجتماعی سطح پر شرک ہے۔ یہ تو ایک فلسفہ ہے' ایک نظام ہے' انسٹیٹیوشن ہے۔ اس میں غیر شعوری کا کوئی سوال نہیں۔ چنانچہ اس وقت غیر اللہ کی حاکمیت سب سے بڑا شرک ہے۔ انسانی حاکمیت (Human Sovereignty) خواہ فردِ واحد کی ہو یا عوام کی' یہ شرک ہے۔ اسی طریقے سے مادّہ پرستی' دنیا پرستی' وطن پرستی' یہ ساری چیزیں نظریاتی ہیں۔ یہ انسان کے شعور اور فلسفہ و فکر سے متعلق ہیں۔ دورِ حاضر میں یہ سب گویا ''اَنۡدَاد'' ہیں' اور الفاظِ قرآنی ان سب کا احاطہ کرتے ہیں: ﴿فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ کہ کم سے کم شعوری طور پر' جانتے بوجھتے تو کسی ہستی کو' کسی ادارے کو' کسی شے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک' اس کا مدمقابل اور اس کے برابر کا نہ بنا دینا۔ ان دو آیات میں توحید کا مضمون مکمل ہو گیا۔ پہلی میں توحید عملی' دوسری میں توحید نظری' توحید عقیدہ!

## آیت ۲۳ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۪

◄ وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لا أَعْلَمُ )) [الادب المفرد: ۷۱۶]

سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے ابو بکر! یقیناً شرک تم لوگوں میں چیونٹی کی چال سے بھی پوشیدہ ہو کر آتا ہے۔'' سیدنا ابو بکرؓ نے عرض کیا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کے علاوہ بھی شرک ہوتا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً شرک چیونٹی کے رینگنے سے بھی زیادہ پوشیدہ طریقے سے داخل ہو جاتا ہے۔ کیا میں تمہاری راہنمائی ایسے کلمات کی طرف نہ کروں کہ جب تم وہ کہہ لو تو چھوٹا بڑا تمام شرک تم سے ختم ہو جائے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم کہو: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں جانتے بوجھتے تیرے ساتھ شرک کروں' اور جو میں نہیں جانتا اس کے بارے میں استغفار کرتا ہوں۔''

وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴿۲۳﴾ ’’اور اگر تم واقعتاً شک میں ہو اِس کلام کے بارے میں جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر (کہ یہ ہمارا نازل کردہ ہے یا نہیں) تو لے آؤ ایک ہی سورت اِس جیسی‘ اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔‘‘

یہاں لفظ نَزَّلۡنَا آیا ہے‘ اَنۡزَلۡنَا نہیں۔ یعنی حضورِ اقدس ﷺ پر قرآن مجید کا نزول بصورت تنزیل ہوا ہے۔ قرآن رفتہ رفتہ‘ جستہ جستہ‘ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ بڑا ہی متجسسانہ (searching) انداز ہے کہ واقعتاً اگر تم کسی شک میں ہو! اصل بات یہ ہے کہ تم شک میں نہیں ہو! یہ تمہاری ڈھٹائی ہے‘ تمہاری ضد اور تعصب ہے‘ حقیقتاً تم شک میں نہیں ہو۔ تم پہچان چکے ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اتمامِ حُجّت کے طور پر فرمایا: ﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا.....﴾ اگر واقعتاً تمہیں ذرا سا بھی شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (حضرت محمد ﷺ) پر نازل فرمایا ہے.....

## نسبتِ عبدیت: کمال شفقت وعنایت

نوٹ کیجیے کہ یہاں ’’عبد‘‘ کی نسبت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر قرآن کریم کا نزول اللہ تعالیٰ کی شفقت اور عنایت کا نزول ہے‘ لہٰذا جہاں بھی حضور ﷺ پر نزولِ قرآن کا تذکرہ آتا ہے وہاں شفقت اور عنایت کا خاص انداز ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں بھی حضور ﷺ کی نسبتِ عروجی بیان کرنا مقصود ہوتی ہے یا مقامِ مدح ہوتا ہے‘ وہاں حضور ﷺ کی نسبتِ عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف دونوں کے آغاز میں آپ ﷺ کی نسبتِ عبدیت کو نمایاں کیا گیا:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِىۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا.......﴾ (آیت ۱)

’’پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندے (ﷺ) کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ (دُور کی مسجد) تک۔‘‘

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾﴾

’’کُل حمد و ثنا اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے نازل کی اپنے بندے پر کتاب اور اس میں اُس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔‘‘

بہت سے مواقع پر خاص طور پر مولانا روم کے حوالے سے مَیں عروجی اور نزولی کیفیات پر تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ عبدیت میں چونکہ بندہ اللہ عزّوجل کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہے تو یہ عروجی کیفیت ہے۔ جب بندہ رسالت کا فرضِ منصبی ادا کرنے کے لیے جا رہا ہے تو اس کا رُخ خلق کی طرف ہے‘ اس اعتبار سے یہ نزولی کیفیت ہے۔ گویا حضور ﷺ جبلِ نور سے اُتر رہے ہیں تو یہ نزولی نسبت ہے۔ آپ ﷺ نے جا کر لوگوں کو خبردار کرنا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے اُتر رہے ہیں تو یہ نزولی کیفیت ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿اِذۡہَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ)۔ البتہ جب حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر تھے یا حضور ﷺ جبلِ نور پر تھے تو یہ عروجی کیفیت ہے۔

## قرآن کریم کا دعویٰ اور چیلنج

فرمایا: اگر واقعتاً تمہیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے ﴿فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ﴾ ’’تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر۔‘‘ اس کے مثل فصاحت میں‘ بلاغت میں‘ عذوبت میں‘ مٹھاس میں‘ صوتی آہنگ میں‘ ہر اعتبار سے‘ جو بھی تمہارے معیارات ہیں انہی کے مطابق تم دعویٰ کر سکو کہ یہ چند الفاظ پر مشتمل ہم ایک کلام موضوع کر کے لائے ہیں جو قرآن جیسا ہے!

﴿وَ ادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ ’’اور پکار لو اپنے تمام حمایتیوں کو اللہ کے سوا۔‘‘ وہ مشرک تھے‘ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ وہ اللہ کو بھی پکارتے تھے اور ان کی دعائیں ’’اَللّٰھُمَّ‘‘ سے شروع ہوتی تھیں۔ لہٰذا فرمایا کہ اللہ کو چھوڑ کر تم اپنے سارے معبودوں کو پکار لو‘ جنّات کو پکار لو‘ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو پکار لو‘ اپنے خطیبوں اور شعراء کو جمع کر لو‘ جس کو پکارنا ہے پکار لو!

**شہید کا مفہوم:** یہاں شُھَدَاء کے لفظ کو بھی سمجھ لیجیے۔ فعل شَھِدَ یَشْھَدُ اصل میں آتا ہے

موجودگی کے لیے۔ ''شاھد'' وہ ہے جو موجود ہے' لیکن یہیں سے اس میں دو اضافی مفہوم پیدا ہوئے۔ اوّلاً یہ کہ گواہی بھی دراصل اُسی کی ہوتی ہے کہ جو وقوعہ پر موجود ہو۔ جو شخص خود موجود تھا وہی گواہی دینے کا اہل ہے۔ وہ چشم دید گواہ ہے' اس نے دیکھا ہے کہ واقعہ کیسے ہوا۔ دوسرے یہ کہ مددگار بھی وہی ہوسکتا ہے جو موجود ہو۔ آپ کا کوئی بڑا حمایتی ہے لیکن وقوعہ کے وقت موجود نہیں ہے تو اُس کی مدد آپ کے لیے مفید نہیں ہوگی۔ تو ''شہید'' کے یہ دونوں ترجمے ''گواہ'' اور ''مددگار'' ثانوی ترجمے ہیں' جبکہ اس کا اصل مفہوم ''موجود'' کا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''اور پکار لو اللہ کے سوا اپنے تمام حمایتیوں (اور مددگاروں) کو اگر تم سچے ہو!'' میں پھر یہاں زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ میرے نزدیک ''اگر تم سچے ہو!'' کا مفہوم یہ ہے کہ تم شک کرنے میں بھی سچے نہیں ہو! یہ بھی تمہارا تصنّع ہے' تمہاری ہٹ دھرمی ہے' حقیقتاً تمہیں کچھ شک نہیں ہے۔ تم اسے صرف ایک ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے ہو۔ باقی اس کا یہ مفہوم بھی ہو جائے گا کہ اگر تمہیں ذرا سا بھی شک ہے تو اس کا ازالہ ہو جائے گا' سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ کلام محمد (ﷺ) نے خود موضوع کر لیا ہے' خود گھڑ لیا ہے' خود بنا لیا ہے تو پھر ٹھیک ہے' تمہارے ہاں بڑے بڑے فصحاء' بلغاء' ادباء' شعراء اور خطباء موجود ہیں' تو تم انہیں بلا کر ایک مقابلہ کر لو!

یہ چیلنج مکی قرآن میں چار مرتبہ پہلے آ چکا ہے۔ دو مرتبہ ان سے پورے قرآن کریم کی نظیر کے لیے مطالبہ کیا گیا۔ سورۃ الطور میں فرمایا:

﴿اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۴﴾﴾

''کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ اس (حضرت محمد ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ ماننے والے نہیں ہیں۔ تو وہ لے آئیں اس جیسی کوئی ایک بات اگر وہ سچے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾﴾

’’آپؐ کہہ دیجیے کہ اگر جمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جنّ اس بات پر کہ وہ اِس قرآن کی مانند لے آئیں تو وہ نہیں لاسکیں گے اس کی مانند‘ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔‘‘

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ ہود میں اس سے ذرا نیچے اُتر کر‘ جسے برسبیلِ تنزّل کہا جاتا ہے‘ فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾ (ھود)

’’کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے: پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو!‘‘

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورۃ کا چیلنج بھی دیا گیا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾﴾ (یونس)

’’کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے: پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو!‘‘

دس سورتیں نہ سہی‘ ایک سورت ہی لے آؤ! قرآن مجید کی مختصر ترین سورتیں تین تین‘ چار چار آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ النصر‘ سورۃ العصر اور سورۃ الکوثر کُل تین تین آیات کی ہیں۔ سورۃ الاخلاص کی کُل چار آیات ہیں۔ یہ اعجازِ قرآنی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ بدترین

دشمنوں نے بھی اُس وقت یہ جرأت نہیں کی کہ ان میں سے کوئی اپنا منظوم کلام یا گھڑا ہوا کلام لا کر جھوٹ موٹ ہی دعویٰ کر دیتا کہ یہ اس قرآن جیسا ہے‘ قرآن کے ہم پلّہ یا قرآن کے مثل ہے۔ ایک اعتبار سے میں ان کی تعریف اور تحسین کرتا ہوں کہ ان میں اس درجے ڈھٹائی نہیں تھی۔ یعنی انہیں بھی اندازہ تھا کہ ہمارے اپنے لوگ بھی اسے قرآن کے مثل تسلیم نہیں کریں گے۔ گویا معاشرے کے اندر عمومی طور پر اتنا شعور تھا کہ کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ قرآن کے مقابلے میں اپنا کوئی کلام پیش کرنے کی جسارت کر سکے۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ قرآن کریم کے اس چیلنج کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ مذکورہ بالا چار مکی مقامات کے بعد یہاں سورۃ البقرہ میں بڑے اہتمام سے یہ دعویٰ اور چیلنج دہرایا گیا۔ آگے فرمایا:

**آیت ۲۴** ﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ’’پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو‘ اور ہرگز نہ کر سکو گے! تو پھر بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن ہوں گے انسان اور پتھر۔ تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔‘‘

کلام میں انتہائی زور ہے: ’’پھر اگر تم نہ کر پاؤ‘ اور ہرگز نہیں کر پاؤ گے!‘‘ یہ ہے اصل میں وہ اِدّعا اور چیلنج۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کلام ہے‘ اور یہ دعویٰ اور اِدّعا اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے‘ جو المتکبر ہے‘ المتعال ہے۔ ’’تم ہرگز نہیں کر پاؤ گے!‘‘ یہ بھی چیلنج کی انتہا ہے۔ یعنی اس کا ردّ کرنے کی بھی کسی کے اندر جرات نہیں ہوئی کہ جھوٹ موٹ ہی سامنے آ جاتا کہ یہ لیں‘ ہم نے کر کے دکھایا ہے۔ چاہے بعد میں فیصلہ ہو ہی جاتا کہ تمہارا یہ کلام قرآن کے ہم پلہ نہیں ہے‘ برابر نہیں ہے‘ اس کی مثل یا نظیر نہیں بن سکتا‘ لیکن ایک دفعہ تو کوئی جھوٹ موٹ کا دعوے دار بن کر ہی سامنے آ جاتا۔ لیکن قرآن کا دوٹوک انداز یہ ہے: ﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا﴾ ’’پھر اگر تم نہ کر پاؤ‘ اور ہرگز نہیں کر پاؤ گے!‘‘

## جہنم کی شدّت وحدّت

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ﴾ ’’تو پھر تم ڈرو اُس آگ

سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔'' تم اس آگ کا ایندھن بنو گے۔ نہ صرف تم بلکہ تمہارے معبود' یہ پتھر جنہیں تم پوجتے ہو' چومتے ہو' چاٹتے ہو' دھوتے ہو' نہلاتے ہو' ان کا دھوون پیتے ہو تبرک کے طور پر' ان سب کو بھی تمہاری حسرت میں اضافے کے لیے تمہارے ساتھ ہی جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اس میں آگ کی شدّت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ایک آگ لکڑی سے جلتی ہے' اور ایک آگ وہ ہے جس میں ایندھن کے طور پر پتھر ڈالے جائیں گے۔ اس کی جو بھی شدّت' تمازت اور حدّت ہو گی اس کا اندازہ کیجیے۔ جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اُس وقت تک انسان کو لکڑی کی آگ کے سوا کسی اور آگ کا ابھی تجربہ نہیں تھا۔ آج تو آگ کی جو اقسام ہمارے علم میں ہیں انہی کی شدّت وحدّت کا ہم کوئی تصوّر نہیں کر سکتے۔ اب جب بیان کیا جاتا ہے کہ سورج کے اندر جو آگ شعلہ زن ہے اس کی کیا شدّت وحدّت ہے اور اس میں جو ایٹمی دھماکے ہوتے ہیں ان کا درجہ حرارت کیا ہے' تو لاکھوں درجے کی بات ہوتی ہے۔ چنانچہ جہنم کی آگ کی کیا کیفیت ہو گی! اعاذنا اللّٰہ منھا[۱]

آخر میں فرمایا: ﴿اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔'' إعداد کہتے ہیں کسی چیز کو تیار کر دینا' فراہم کر دینا' کسی مقصد کے لیے پوری طرح آراستہ پیراستہ کر دینا۔ اس کے اندر اس کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے کا سامان

---

(۱) آتش فشاں سے نکلنے والے lava کا درجہ حرارت 700 سے 1200 ڈگری سنٹی گریڈ کے درمیان ہوتا ہے۔ سورج کی سطح (surface) کا درجہ حرارت 5,500 سے 5,800 ڈگری سنٹی گریڈ ہے' جب کہ سورج کے مرکز (core) کا درجہ حرارت انتہائی زیادہ' تقریباً 1.5 کروڑ سینٹی گریڈ ہے' جہاں شدید ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے روشنی اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔ صحیح حدیث کے مطابق سورج اور چاند جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ثوران مُكَوَّران فِى النَّارِ يَوْمَ الْقِيامة))

[سلسلة الاحاديث الصحيحة:۴۰۰۸]

''قیامت کے دن سورج اور چاند دونوں کو لپیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

(حاشیہ از مرتّب)

ودیعت کردیا جانا۔ چنانچہ وہ آگ تیار کردی گئی ہے کافروں کے لیے۔ جو بھی انکار کریں گے اور کفر کریں گے ان کا وہ استقبال کرے گی۔ اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ!

## چند مباحث کا اعادہ

اس رکوع کی پہلی پانچ آیات میں قرآن کریم کی دعوت کا لُبِ لُباب بھی آ گیا ہے اور اس کے اساسی نظریات کا خلاصہ بھی۔ دعوت تو ایک ہی آیت کے اندر مکمل آ گئی:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کی دعوت یہی عبادتِ ربّ‘ بندگیٔ ربّ رہی‘ اور یہی قرآن حکیم کی بنیادی دعوت ہے۔ قرآن اپنی دعوت کا آغاز اسی لفظ ’’عبادت‘‘ سے کر رہا ہے۔ یہی انسانوں اور جِنّات کی غایتِ تخلیق ہے۔ اس اعتبار سے دعوت تو پہلی آیت میں آ گئی‘ لیکن اگر پہلی دو آیات کو جمع کریں تو ان میں اسلام کے اساسی نظریہ یعنی توحید کی تکمیل ہو گئی۔ توحیدِ عملی: ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ اور توحیدِ صفاتی‘ توحیدِ نظری یا توحید فی العقیدہ: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

یہ بڑا حسین توازن پیدا ہوا ہے۔ سورۃ البقرہ کے دو رکوعوں میں کلام انشائیہ نہیں بلکہ کلام خبریہ آیا ہے‘ لیکن یہاں ان آیات میں کلام انشائیہ آیا ہے‘ اس توازن کے ساتھ کہ ایک امر ہے اور ایک نہی ہے۔ ﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ امر ہے‘ جب کہ ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ نہی ہے۔ کلام انشائیہ امر اور نہی دونوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔

اس کے بعد کی تین آیات میں تقسیم دیکھیے کہ ڈیڑھ آیت میں رسالت کا ذکر ہے اور ڈیڑھ آیت میں آخرت کا۔ چنانچہ یہی ہمارے دین کے اساسی نظریات ہیں اور یہی ایمان ہے۔ ایمان کی اصل جڑ اور بنیاد تو ہے ایمان باللہ‘ توحید کے ساتھ‘ دو آیات میں اس کا بیان ہوگیا۔ اس کے بعد ہے ایمان بالرسالت۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو آپؐ پر نازل ہوا۔ مشرکینِ مکہ انکار محمد بن عبداللہ کا نہیں‘ بلکہ

محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کرتے تھے۔ گویا اصل انکار تو قرآن کا تھا۔ اس اعتبار سے نبوت و رسالت کا مضمون آ گیا: ﴿وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا ........﴾

پھر چوتھی آیت کے وسط سے ہی آخرت کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ آخرت کا بیان یہاں فلسفیانہ انداز میں نہیں ہو رہا۔ جہنم اور جنت کا تذکرہ ہی معاد یعنی آخرت ہے۔ یہ اسلام کے اساسی نظریات میں سے تیسرا بنیادی نظریہ ہے۔ آخرت کی زندگی کی دو کیفیات ہیں: اِنَّھا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا او لَنارٌ اَبَدًا ''ہمیشہ ہمیش کی جنت یا ہمیشہ ہمیش کی جہنم۔'' چنانچہ فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''تو بچو اور ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔ وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔'' پوری طرح آراستہ پیراستہ کی گئی ہے، تم سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کا پورا اہتمام کر لیا گیا ہے۔ اس کے بعد پانچویں آیت میں اسی معاد کا دوسرا رُخ ہے:

**آیت ۲۵** وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ کُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ٭ۙ وَّهُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾ ''اور بشارت دے دیجیے (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے کہ اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔ جب بھی انہیں دیا جائے گا وہاں کا کوئی پھل رزق کے طور پر (یعنی کھانے کے لیے) وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی ملتا تھا اور دیے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے۔ اور ان کے لیے اُس (جنّت) میں نہایت پاک باز بیویاں ہوں گی، اور وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

## ''عملِ صالح'' کا مفہوم

﴿وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) بشارت

دے دیجیے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔‘‘ ’’عملِ صالح‘‘ کے حوالے سے ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں اپنے تصور کے مطابق کوئی نہ کوئی ہیولا موجود ہے۔ اکثر و بیشتر جب اس کا ذکر آتا ہے تو اسے ’’عبادات‘‘ تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ ’’عمل‘‘ کا لفظ ’’فعل‘‘ کے مقابلے میں آتا ہے اور ’’فعل‘‘ کا اطلاق ہر کام پر ہو جاتا ہے جو انسان بالارادہ کرے یا غیر ارادی طور پر اُس سے سرزد ہو جائے۔ پھر وہ کام خواہ آرام سے ہو جائے یا مشقت طلب ہو‘ وہ فعل ہے۔ البتہ جو کام مشقت طلب ہو اور پورے اہتمام‘ ارادے اور پوری توجہ کے ساتھ کیا جا رہا ہو وہ ’’عمل‘‘ کہلاتا ہے۔ ’’صالح‘‘ وہ کام ہے جس میں نشوونما کی صلاحیت ہے۔ درحقیقت انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافتِ ارضی کے لیے پیدا کیا ہے‘ جو اگلے رکوع کا مضمون ہے۔ ’’خلافت‘‘ کے اس مرتبے کے تعین کے لیے انسان میں جو potential ودیعت کیا گیا ہے اس کو realize کرنے اور اس کو حاصل (achieve) کرنے کے لیے بھرپور محنت کرنی پڑتی ہے۔ بقول حالی ؎

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ!

یہ محنت و مشقت ہی دراصل عمل صالح ہے۔ جس انسان میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے اصل منصب یعنی خلیفۃ اللہ ہونے کی تحصیل کر سکے‘ اس کے لیے اسے چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔ اس کے لیے محنت کرنا پڑے گی‘ مشقت کرنا ہوگی۔ اس کے لیے اپنی خواہشات پر قدغنیں لگانا ہوں گی‘ اپنا آرام تج دینا ہوگا۔ اُس کے لیے اپنے بہت سے مفادات قربان کرنا ہوں گے‘ اپنی بہت سی محبوب چیزوں کی قربانی دینا ہوگی۔ ان سب کا مجموعہ عمل صالح ہے۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی ﷺ! بشارت دے دیجیے اُن کو جو ایمان لائے اللہ کی توحید پر‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر‘ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر‘ بعث بعد الموت پر‘ انہوں نے مانا جنت اور دوزخ کو‘ اور وہ اپنے ربّ کے مطیع فرمان بندے بننے کے لیے مسلسل محنت اور مشقت کرتے رہے ﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کہ اُن کے لیے ہوں گے وہ باغات جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔

## لفظ ’’جنت‘‘ کا معنی و مفہوم

جنت کے لفظ کو پہچان لیجیے۔ ’’ج ن ن‘‘ کا مادّہ عربی زبان میں کسی چیز کے چھپ جانے یا چھپا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں آتا ہے: ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیۡہِ الَّیۡلُ رَاٰ کَوۡکَبًا﴾ (الانعام: ۷۶) ’’تو جب اُن پر رات (کی تاریکی) کا پردہ چھا گیا تو انہوں نے دیکھا ایک ستارہ۔‘‘ اسی لیے جنین کہتے ہیں اُس بچے کو جو رحم مادر میں ہے۔ معلوم تو ہے کہ بچہ ہے لیکن نظر نہیں آ رہا‘ چھپا ہوا ہے‘ مخفی ہے۔ ’’جِنّ‘‘ وہ مخلوق ہے جو نظر نہیں آتی۔ ایک رائے ہے کہ انسان اَنس سے بنا ہے جو نظر آتا ہے‘ مرئی ہے‘ جبکہ جِنّات وہ ہیں جو نظر نہیں آتے‘ مخفی ہیں‘ غیر مرئی ہیں۔ باغ کو جنّت اس لیے کہا جاتا ہے کہ زمین کو اُس کے اوپر کا سبزہ ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ بہت خوب صورت انداز ہے۔ ہوائی جہاز کے سفر میں ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں لق و دق صحرا ہے‘ زمین عریاں نظر آ رہی ہے۔ جہاں کوئی نباتات ہے‘ جنگل ہے یا کہیں کھیت ہیں‘ ہریالی ہے تو زمین نظر نہیں آئے گی‘ وہ چھپ گئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَہَا وَ ازَّیَّنَتۡ﴾ (یونس: ۲۴) ’’یہاں تک کہ جب زمین اچھی طرح اپنا سنگھار کر لیتی ہے اور خوب مزیّن ہو جاتی ہے۔‘‘ درحقیقت یہ ساری ہریالی اُس کا تزین ہے۔ اس نے اس کے ذریعے سے خود کو مزیّن کر لیا ہے‘ زینت اختیار کر لی ہے اور خود چھپ گئی ہے۔

﴿جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ﴾ ’’ایسے باغات جن کے دامن میں ندیاں رواں ہوں گی۔‘‘ مَیں یہ ادبی ترجمہ کر رہا ہوں‘ لفظی ترجمہ ہوگا: ’’جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔‘‘ اس لیے کہ تحت کے معنی ’’نیچے‘‘ کے ہیں۔ تحت اور فوق ظرف کے لیے آتے ہیں۔ تحت کسی شے کے نیچے اور فوق کسی چیز کے اوپر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ تصور ذہن میں رکھیے کہ کہیں natural vegetation ہو تو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے‘ خاص طور پر عرب میں جہاں قرآن کریم نازل ہو رہا تھا‘ کہ اونچی نیچی زمین ہے‘ پہاڑی علاقہ ہے۔ نیچے وادی میں ندی رواں دواں ہے تو اس سے خود بخود سیرابی ہو رہی ہے۔ دونوں طرف اونچی جگہ کے لیے گویا آب پاشی کا ایک فطری بندوبست ہے۔ درختوں کی جڑوں

میں خودبخود پانی پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ اس کی صحیح تعبیر یہی ہوگی کہ دامن میں ندیاں بہتی ہیں۔ یہاں مجھے علامہ اقبال کی نظم ’’ایک آرزو‘‘ کے اشعار یاد آ رہے ہیں‘ اس میں بھی لفظِ دامن ہے: ع ’’دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو!‘‘ اسی میں ندی کا تذکرہ بھی موجود ہے کہ اُس کا ع ’’پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو!‘‘

’’نَهَرَ يَنْهَرُ (ف) نَهْرًا ‘‘ یہ فعل دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو پانی کے بہنے یا بہانے کے لیے‘ نہر جاری کرنا وغیرہ۔ اس معنی میں نہر‘ دریا‘ ندی‘ نالہ سب ’’أنہار‘‘ کے تحت آ جائیں گے۔ یہی فعل (سائل کو) جھڑکنے اور ڈانٹنے کے لیے بھی آتا ہے: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾﴾ (الضحیٰ) ’’اور آپ کسی سائل کو نہ جھڑکیں!‘‘

## جنّت کی نعمتوں کی کیفیت

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا﴾ ۔ كُلَّمَا: جب جب بھی‘ جب بھی کبھی۔ رُزِقُوْا: دیے جائیں گے۔ مِنْهَا: اس میں سے۔ مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا: پھلوں کی صورت میں رزق۔ ثمر اگر بغیر ’’ۃ‘‘ کے آئے تو یہ جنس ہے۔ شجر‘ پودا یا درختوں کی جنس۔ اس میں ’’ۃ‘‘ تائے تانیث نہیں بلکہ تائے وحدت ہے۔ شَجَرَة: ایک درخت‘ شَجَر: بہت سے درخت۔ اسی طرح ثَمَر: بہت سے پھل‘ میوے یا میوے کی جنس‘ اور ثَمَرَة: کوئی پھل‘ کوئی ایک میوہ۔ تو بامحاورہ ترجمہ یوں ہوگا: ’’جب جب بھی دیا جائے گا انہیں ان (باغات) میں سے کوئی پھل بطور رزق۔‘‘ رِزْقًا یا تو رُزِقُوْا کا مفعول مطلق ہے‘ یا یہ تمیز ہے‘ یا حال کے طور پر آیا ہے۔ ﴿قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ ’’وہ کہیں گے: یہ تو وہی شے ہے جو دی گئی تھی ہمیں پہلے۔‘‘ یہ تو ہمیں پہلے بھی دیا جاتا رہا ہے۔ ﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ ’’اور دیے جائیں گے ان کو (پھلوں یا رزق کی شکل میں) وہ چیزیں جو ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گی۔‘‘ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں گی‘ ایک دوسرے سے مماثل ہوں گی۔

یہ مقام مشکلاتِ قرآن میں سے ہے‘ اور اگلی آیت کے ساتھ بھی اس کا ایک ربط وتعلق ہے۔ یعنی جب بھی جنتیوں کو پھل عطا ہوں گے تو وہ پکار اُٹھیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی ملا تھا۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جنت میں اہلِ جنت کو جو پھل ملیں گے وہ

شکل وصورت کے اعتبار سے دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ قرآن کریم میں بھی کئی پھلوں کا ذکر آیا ہے‘ مثلاً رُمان‘ نخل‘ اعناب۔ وہ سارے کے سارے پھل جو یہاں زمین پر ہیں وہاں جنت میں بھی ہوں گے‘ لیکن ذائقے کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ جنت کی نعمتوں کی اصل حقیقت کے بارے میں ایک حدیث قدسی میں آیا ہے:

((أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ )) [متفق علیہ]

’’میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا‘ اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا گمان تک گزرا۔‘‘

یعنی کسی انسان کے قلب پر اس کا احساس‘ شعور اور ادراک بھی وارد نہیں ہوا۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ مماثلت بھی ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ جب تک اُن چیزوں سے تشبیہ اور تمثیل نہ دی جائے جنہیں ہم پہچانتے ہیں تو جنت کی نعمتوں کا تذکرہ آخر کیسے کیا جائے؟ وہ چیز جو ہمارے لیے ناقابلِ تصوّر (unimaginable) ہے‘ اس کے لیے تشبیہ اور تمثیل تو ان ہی چیزوں سے دینی ہوگی جو ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں۔ اس اعتبار سے شکل وصورت میں وہ اُن سے مشابہ ہوں گی جو انسان دنیا میں کھاتا رہا۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جنت میں وہ پھل جب انہیں بار بار ملیں گے تو دیکھنے میں تو ایک سے ہوں گے لیکن ہر مرتبہ اُن کی لذت الگ ہوگی۔ اس لیے کہ یکسانیت (monotony) سے انسان کی طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ چنانچہ ایک ہی چیز مسلسل ایک ہی ذائقہ میں نہیں ملے گی۔ اگرچہ وہ رُمان رُمان ہی رہے گا لیکن ہر بار اس کا ذائقہ بدلتا رہے گا۔ اس میں نئی رعنائی‘ نئی کیفیت اور نئی لذت پیدا ہوتی رہے گی۔

اس کا ایک صوفیانہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ درحقیقت انسان اس دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے اُس کا ایک روحانی ذائقہ ہے۔ آپ نے کوئی نیکی کی تو اس سے مسرت حاصل ہوتی ہے‘ انبساط ہوتا ہے‘ طبیعت میں خوشی ہوتی ہے۔ گویا ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔ آخرت میں ملنے والی لذّت اس لذّت سے مشابہ ہوگی۔ جب اہلِ جنت کو نیکیوں کی جزا

میں نعمتیں ملیں گی تو اُس وقت یاد آئے گا کہ یہ وہ لذت ہے جس کا احساس ہمیں دنیا میں ہوا تھا جب ہم نے فلاں نیکی اور خیر کا کام کیا تھا۔ اسی طریقے سے گناہ اور بُرے اعمال کی تلخی کو فطرتِ انسانی محسوس کرتی ہے‘ ان سے اِبا کرتی ہے اور انسان کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اس اعتبار سے عمل چاہے نیکی کا ہو یا بدی کا‘ اُس کا ایک ذائقہ ہے۔ اہل جنت کو احساس ہوگا کہ یہ وہی لذت ہے جس کا تجربہ ہمیں دنیا میں ہو چکا ہے جب ہم نے اللہ کی توفیق سے نیکی اور خیر کے کام کیے تھے۔

مولانا اصلاحی صاحب کا مزاج اگرچہ متصوفانہ نہیں ہے‘ لیکن انہوں نے بھی یہاں ’’رزق‘‘ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’یہ لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن میں بھی رزقِ مادّی اور رزقِ روحانی دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی کو رزق نہیں سمجھنا چاہیے‘ بلکہ اصلی رزق وہ علم و معرفت ہے جو قرآن اور پیغمبرﷺ سے ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اسی وجہ سے وحی کو قرآن نے رزق سے تعبیر فرمایا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔‘‘

## ’’ازواجِ مطہرہ‘‘ کا مفہوم

﴿وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ ’’اور ان کے لیے ہوں گی اُس میں نہایت پاک باز بیویاں۔‘‘ نہایت پاکیزہ‘ انتہائی پاک کی ہوئیں۔ مُطَهَّرَةٌ ’’تطہیر‘‘ سے اسم مفعول ہے۔ طَهَّرَ يُطَهِّرُ تَطهيرًا: بڑے اہتمام اور بڑی جِدّ وجُہد سے کسی شے کو پاک کر دینا‘ صاف کر دینا بایں طور کہ اس میں کسی قسم کی کثافت‘ گندگی یا آلائش باقی نہ رہنے دینا۔ جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿٣٣﴾﴾

’’اللہ تو بس یہی چاہتا ہے اے نبیؐ کے گھر والو! کہ وہ دور کر دے تم سے ناپاکی اور تمہیں خوب اچھی طرح پاک صاف کر دے۔‘‘

جو بات کسی درجے میں بھی تمہارے مقام و مرتبہ اور منصب سے مناسبت رکھنے والی نہیں ہے‘ وہ تمہاری شخصیت اور سیرت وکردار میں باقی نہ رہے۔ اسی لیے اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کو ’’ازواجِ مطہرات‘‘ کہا جاتا ہے۔

’’زوج‘‘ کا لفظ عربی زبان میں جوڑے کے لیے آتا ہے۔ شوہر کے لیے بیوی زوج ہے اور بیوی کے لیے شوہر زوج ہے۔ تائے تانیث کے ساتھ ’’زوجہ‘‘ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا‘ بلکہ عربی زبان میں بھی صرف نجد کے علاقے کی ایک بولی (colloquial language) میں ’’زوجہ‘‘ اور اس کی جمع ’’زوجات‘‘ آتی ہے‘ باقی پورے عرب میں کہیں بھی تائے تانیث کے ساتھ ’’زوجہ‘‘ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ جوڑے کے دونوں افراد میں سے ہر ایک فرد (spouse) کو ’’زوج‘‘ کہا جائے گا اور دونوں کو ’’زوجین‘‘۔ واضح رہے کہ ’’زوجین‘‘ سے مراد دو جوڑے نہیں ہوتے‘ بلکہ ایک جوڑے کے دو فرد یعنی بیوی اور شوہر‘ مرد اور عورت۔ قرآن کریم میں ’’زوجین‘‘ کا لفظ آٹھ مرتبہ آیا ہے۔ لفظ ’’زوج‘‘ تین مرتبہ شوہروں یا خاوندوں کے لیے بھی آیا ہے جب کہ پچاس سے زائد مرتبہ خواتین (بیویوں) ہی کے لیے آیا ہے۔ یہاں پر چونکہ مذکر کی ضمیر (لَھُمۡ) ویسے ہی قرینہ ہے لہٰذا یہاں ’’ازواج‘‘ کا ترجمہ ’’بیویاں‘‘ ہی کرنا ہوگا‘ اگرچہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ مذکر کا صیغہ قرآن مجید میں بر سبیلِ تغلیب آ جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی مجمع ہو جس میں عورتیں بھی ہوں اور مرد بھی ہوں‘ انہیں خطاب کرنا ہو تو صیغہ خطاب مذکر کا ہوگا اور وہ گویا دونوں پر محیط ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں غالب عنصر مرد ہے‘ تو جب مرد کو خطاب کر لیا تو عورت اس میں از خود داخل ہو گئی۔ البتہ اصلاً ’’زوج‘‘ کا لفظ چونکہ دوطرفہ ہے اور مَردوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مطہر ازواج رکھی ہیں تو اللہ تعالیٰ نیک بیویوں کے لیے یقیناً نیک شوہر عطا فرمائے گا۔

﴿وَّ ھُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ﴾ ’’اور اُس (جنت) میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘ اُس زندگی کے لیے کوئی انقطاع نہیں ہے‘ کوئی خاتمہ نہیں ہے۔ اللھم رَبَّنا اجعلنا منھم!

(جاری ہے)

# حقیقتِ عملِ صالح

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خطبۂ مسنونہ کے بعد سورۃ الحجرات (آیت ۱۴)‘ سورۃ الحج (آیات ۷۷ و ۷۸) اور سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات کی تلاوت کی گئی۔ ادعیہ ماثورہ کے بعد خطاب کا آغاز فرمایا۔

## تمہیدی گفتگو

میں نے جو تحریکِ قرآنی شروع کی ہے‘ اس کا آغاز ۱۹۶۵ء میں لاہور سے ہوا۔ اب تک مَیں اپنی زندگی کے ۲۰ برس اس میں کھپا چکا ہوں۔ اس تحریک کے لیے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کو ابتدائی ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اگرچہ مصحف میں سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الناس تک جو ترتیب ہے وہی اصل اور مکمل قرآن ہے لیکن اس پورے قرآن کو تسلسل‘ غور وفکر اور تدبّر کے ساتھ پڑھنے کے لیے ایک بڑی مضبوط قوتِ ارادی اور عزم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے میں نے یہ مفید پایا کہ اگر قرآن مجید کے منتخب مقامات کا تعارف کروا دیا جائے تو اس طرح قرآن مجید کے اہم مضامین سے ذہنی مناسبت پیدا ہوتی ہے اور مطالعہ کا شوق بڑھتا ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو تو انسان میں ایسا ارادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ پورے قرآن حکیم پر بھی غور وفکر کر لے۔

مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اولاً تو دین کی جامعیت سامنے آ جائے‘ یعنی دین اسلام معروف معنی میں مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ آج زیادہ تر یہی کہا جاتا ہے کہ ہمارا مذہب اسلام ہے‘ حالانکہ لفظ ’’مذہب‘‘ پورے قرآن

حکیم میں کہیں نہیں آیا۔ حدیث کا پورا ذخیرہ تو بہت وسیع و عریض ہے‘ اس کے مطالعہ کا تو میں دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن جتنی بھی احادیث میری نظر سے گزری ہیں‘ لفظ ’’مذہب‘‘ کسی حدیث میں نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف ’’مذہب‘‘ کا لفظ محدود معنی میں استعمال کرتے تھے۔ مذہبِ حنفی‘ مذہبِ شافعی‘ مذہبِ مالکی‘ مذہبِ حنبلی‘ مذہبِ اہلِ حدیث؛ یہ سب مذاہب ہیں جب کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ (آل عمران:۱۹)

دین دراصل مکمل نظامِ اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری زندگی پر حاوی و مسلط ہو۔ یہ پوری انسانی زندگی کو اپنے حیطہ اقتدار میں لینے والی شے ہے‘ جس کے لیے جدید اصطلاح ’’نظام‘‘ کی ہے۔ ’’نظام‘‘ کا لفظ بھی قرآن حکیم میں نہیں آیا لیکن اگر دین کے مفہوم کو کسی جدید لفظ میں ادا کیا جائے تو وہ یہی ہے۔ دین اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظامِ زندگی ہے جس میں انفرادی و اجتماعی پہلو‘ سیاسیات‘ اقتصادیات‘ عائلی معاملات‘ سماجیات‘ قانون اور اس کے جملہ گوشے فوجداری‘ دیوانی‘ شہادت‘ وراثت ہر شے موجود ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو دین کے اندر موجود نہ ہو۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس دین کا حصہ ہے۔ یہود کے اعتراض پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ تم ان کو جواب دو کہ ہاں‘ ہمارے نبی ﷺ نے تو ہمیں استنجا کرنا بھی سکھایا ہے‘ ہمیں تو اس پر فخر ہے۔ انسان کے لیے طہارت و پاکیزگی ایک نہایت ضروری عمل ہے تو ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں اس کی تعلیم بھی دی ہے۔ گویا دین چھوٹی چھوٹی باتوں سے نظامِ حکومت کے چوٹی کے معاملات تک پر مشتمل ہے۔ لہٰذا سب سے اہم بات اچھی طرح ذہن نشین کرنا یہ ضروری ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ چھ امور مل کر دین بناتے ہیں۔ ان میں سے پہلی تین چیزیں جمع ہو کر مذہب بنتا ہے یعنی عقائد‘ عبادات اور کچھ معاشرتی رسومات (پیدائش‘ شادی‘ موت وغیرہ سے متعلق)۔ دنیا میں مذہب کا تصور یہیں تک ہے۔ اس سے آگے کی تین چیزیں معاشرتی نظام‘ اقتصادی نظام‘ سیاسی نظام ہیں جو اجتماعیت سے متعلق ہیں۔ ان چھ چیزوں کو جمع کریں تو دین بنے گا۔ چنانچہ دینِ اسلام میں عقائد‘

عبادات‘ رسومات‘ سیاسی نظام‘ معاشی نظام‘ سماجی نظام سب شامل ہیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ اس منتخب نصاب میں زیادہ تر پیشِ نظر یہ واضح کرنا ہے کہ ہمارے دینی فرائض کیا ہیں! دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟ از روئے قرآن‘ انسان کی نجات کی شرائط کیا ہیں؟ فرائض کے حوالے سے انسان کا شعور اگر محدود ہو جائے تو اس کا عمل بھی محدود ہو جاتا ہے۔ سادہ سی مثال ہے کہ کسی شخص کو ایسی ملازمت پر رکھا گیا جہاں اسے گن کر دس کام روزانہ کرنے کو دیے گئے۔ اب اگر کسی حادثہ کی وجہ سے اس کو سات کام بھول گئے اور تین ہی یاد رہے تو چاہے وہ کتنا ہی مخلص و محنتی آدمی ہو لیکن بھول جانے کی وجہ سے اس کا سارا اخلاص ومحنت ان ہی تین کاموں تک محدود رہے گا۔ نتیجتاً وہ تین کام تو بڑی جان مار کر کرے گا لیکن باقی سات کام میں وہ زیرو ہو جائے گا‘ کیونکہ وہ تو اس کے سامنے ہی نہیں رہے۔ اس طرح وہ اپنے مالک کے نزدیک تو ناکام ہی ٹھہرے گا۔ چاہے اس کا خلوص اور محنت صد فیصد ہو لیکن پھر بھی کامیاب نہ ہوا‘ کیونکہ اس کو اپنے سات فرائض تو یاد ہی نہیں رہے۔ اب خدانخواستہ کہیں ایسا معاملہ ہمارے ساتھ ہو کہ ہمیں دین کے بہت سے فرائض یاد ہی نہ ہوں تو جو تھوڑے سے معلوم ہیں‘ ان پر ہی اپنا زور لگا رہے ہوں گے‘ چاہے کتنے ہی خلوص سے کر رہے ہوں۔ ایسے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناکام نہ قرار پائیں۔ لہٰذا اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ دین ہم سے کیا چاہتا ہے! دین کے فرائض کا جامع تصور کیا ہے؟ اسی کے لیے منتخب نصاب مرتب کیا گیا ہے جس کا نقطہ آغاز ”راہِ نجات“ کے عنوان سے سورۃ العصر ہے۔

## ایمان اور عملِ صالح کا ربط و تعلق

پچھلی نشستوں سے قرآن حکیم کے اہم موضوعات کا بیان ایک معنوی تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اس سے پہلے ایمان کے حوالہ سے تفصیلی گفتگو کی گئی تھی۔ اس ضمن میں آج ایمان اور عملِ صالح کا ربط و تعلق اور عملِ صالح کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایمان کے دو درجے ہیں:

(۱) قانونی ایمان یعنی اسلام: اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو مسلمان سمجھا جائے

اور اس کے ساتھ مسلمان کا سا معاملہ کیا جائے۔

(۲) حقیقی ایمان کا حاصل یہ ہے کہ آخرت میں اسے مومن سمجھا جائے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے صاحبِ ایمان کے لیے بیان فرمایا ہے۔

اس حوالہ سے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ بہت اہم ہے‘ جس کی ابتدا میں تلاوت کی گئی۔ فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾﴾

’’بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے‘ اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم (اس حال میں بھی) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے کسی عمل میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

اس آیت میں الاعراب کا ’’ال‘‘ لامِ حصر نہیں بلکہ کچھ خاص لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کے اسلام کو تو تسلیم کیا جا رہا ہے لیکن اُن کے ایمان کی نفی کی گئی ہے (گویا واضح ہوا کہ ایمان اور اسلام الگ شے ہیں)۔ ایک گروہ کے ایمان کی کُلّی نفی کی جا رہی ہے لیکن ان کے اسلام کو قبول کیا جا رہا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم کامل ہے‘ وہ ہر ایک کے بارے میں جانتا ہے کہ کس کا ایمان صرف اقرار باللسان (tip of the tongue) کے درجہ پر ہے یا دل میں داخل ہو گیا ہے۔ زبان سے تو کہہ رہے ہیں:

اَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ۔ آمَنۡتُ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الۡیَوۡمِ الۡآخِرِ وَ الۡقَدۡرِ خَیۡرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ الۡبَعۡثِ بَعۡدَ الۡمَوۡتِ۔ آمَنۡتُ بِاللّٰهِ کَمَا هُوَ بِاَسۡمَائِهٖ وَ صِفَاتِهٖ وَ قَبِلۡتُ جَمِیۡعَ اَحۡکَامِهٖ اِقۡرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصۡدِیۡقٌ بِالۡقَلۡبِ

لیکن اگر ایمان دل میں داخل نہ ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ کی نظر میں مومن نہیں سمجھا جائے گا۔

ایمان کا دعویٰ درحقیقت اُسی وقت تسلیم ہوگا جب وہ دل میں راسخ اور جاں گزیں ہوجائے۔ یہاں پر اِس بات کو منفی اسلوب میں کہا گیا ہے‘ جبکہ اسی بات کو مثبت انداز میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حوالہ سے یوں کہا گیا کہ:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات: ۷)

’’لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب کر دیا اور اِسے تمہارے دلوں میں مزیّن کر دیا۔‘‘

یعنی ان کا ایمان محض زبانی اقرار نہیں تھا بلکہ دل میں جاں گزین ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں ذکر کیا جا رہا تھا‘ اُن کی زبان پر تو ایمان تھا لیکن ان کے دل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اُن سے یہ کہا گیا کہ تم اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتے ہو مگر مؤمن نہیں۔

ہمارے اسلاف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد جو چوٹی کی شخصیات سامنے آئیں‘ ان کی دو بنیادی قسمیں محدّثین کرام اور فقہاء کرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک میں جمع فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سینکڑوں صحابہ کرامؓ نے سن کر حفظ کر لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دَور میں قرآن مجید کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن مجید کے لیے ایک ہی طرزِ کتابت رائج کر دیا گیا اور اس طرح دورِ خلافتِ راشدہ میں قرآن مجید کی حفاظت کا عمل آخری درجہ پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد اصل مرحلہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوالِ مبارک کو جمع کرنے کا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رفتہ رفتہ مدینہ سے منتشر ہو گئے تھے۔ کچھ دمشق میں‘ کچھ کوفہ‘ کچھ قسطنطنیہ کی طرف چلے گئے۔ اِن سب کے پاس احادیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام موجود تھیں۔ ان احادیثِ مبارکہ کے جمع کرنے‘ ان کی چھان پھٹک کرنے‘ ان کو مرتب کرنے کے لیے محدثین کرام نے اپنی پوری زندگی لگائی۔ یہ لوگ اس اُمّت کے بہت بڑے محسن ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابیؓ کے پاس کوئی حدیث دو راویوں کے ذریعہ پہنچی جبکہ اس حدیث کے دراصل تین راوی تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ اس کے تیسرے راوی دمشق میں ہیں۔ چنانچہ وہ مدینہ

سے سفر کر کے اُن صحابی سے ملنے دمشق گئے اور اُن سے پوچھا کہ کیا آپؓ حضور ﷺ کی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں! انہوں نے کہا' جی ہاں اور وہ حدیث سنا دی ۔ ان صاحب نے حدیث سنی اور اپنی سواری سے اُترے بھی نہیں' واپس مدینہ کی طرف چل دیے ۔ جب اُن سے کہا گیا کہ آرام کے لیے یہاں کچھ قیام کر لیں تو کہنے لگے کہ نہیں' مَیں اپنے اس سفر میں کوئی اور مقصد جمع کرنا نہیں چاہتا' میں صرف اِس حدیثِ رسولؐ کو سننے کے لیے ہی آیا تھا۔ بہر حال یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی کہ محدّثین کرام نے احادیث رسول ﷺ جمع کرنے کے لیے کس قدر مشقتیں جھیلیں ہیں' جب کہ جدید دور میں انکارِ حدیث کا فتنہ اُٹھا دیا گیا ہے ۔ ان محدّثین کرام میں امام مسلم' امام مالک' امام ترمذی' امام احمد بن حنبل' امام ابن ماجہ' امام ابو داوٗد رحمہم اللہ علیہم وغیرہ کے نام شامل ہیں لیکن چوٹی پر رئیس المحدثین امام بخاریؒ کو مانا جاتا ہے۔

اسلاف میں دوسرا اہم طبقہ فقہاء کرام رحمہم اللہ علیہم کا ہے' جن کا کردار اس وقت سامنے آیا جب قرآن مجید کتابی شکل میں جمع ہو گیا اور پھر تدوینِ حدیث بھی ہو گئی ۔ اب زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے قرآن واحادیث سے احکامات نکالنا اور جہاں پر کوئی براہِ راست حکم نہ مل رہا ہو تو اس کے لیے استدلال کرنا' اگر ایک ہی موضوع پر مختلف احادیث مل رہی ہوں تو اس کی تطبیق کرنا' قرآن حکیم کے ساتھ حدیث مبارک کا ربط تلاش کرنا' یہ سارے کام فقہاء کرامؒ نے انجام دیے ۔ اِن میں امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ علیہم وغیرہ شامل ہیں لیکن چوٹی پر سید الفقہاء امام اعظم ابوحنیفہؒ کا نام آتا ہے۔ پوری دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ دینی احکامات کے قانونی پہلو کا فہم (legal sense) امام ابوحنیفہؒ کو سب سے بڑھ کر تھا۔ انبیاء ورُسل علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے استثناء کے بعد باقی نوعِ انسانی میں سے دنیا کا کوئی بھی شخص اس حوالے سے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ایک شے کا قانونی تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اور اخلاقی تقاضا کچھ اور۔ یہ دونوں متضاد ہیں ۔ اگر کوئی ہمیں تھپڑ مار دے تو اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ معاف کر دیا جائے لیکن قانونی تقاضا یہ ہے کہ اُسے بھی ویسا ہی تھپڑ مارا جائے ورنہ اس کی ہمت افزائی ہو گی ۔ قانون

کا تقاضا تو یہ ہے کہ ﴿وَالۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ﴾ (المائدۃ:۴۵) دانت کے بدلے دانت‘ کان کے بدلے کان‘ جبکہ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَ تَصۡفَحُوۡا وَ تَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾﴾ (التغابن) ’’اور اگر تم معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بھی غفور و رحیم ہے۔‘‘ پس کسی معاملہ کے اخلاقی پہلو پر نظر رکھنا ایک الگ مزاج ہے جبکہ اس کے قانونی پہلو کی گہرائی میں اُترنا اور بات ہے۔ بہرحال اس اعتبار سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ثانی نہیں۔

## قانونی اور حقیقی ایمان کا فرق

یہ ساری تمہید بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ایمان جیسی بنیادی بات کے بارے میں رئیس المحدثین امام بخاریؒ اور سید الفقہاء امام ابوحنیفہؒ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الایمان قول و لا یزید و لا ینقص۔ ایمان قول کا نام ہے (جس کا عمل سے کوئی تعلق نہیں) اور یہ نہ بڑھتا ہے اور نہ ہی گھٹتا ہے۔ اس کے برعکس‘ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: الایمان قول و عمل یزید و ینقص۔ ایمان قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے‘ یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ اِن دونوں باتوں میں بظاہر بُعد المشرقین ہے لیکن درحقیقت یہ دونوں باتیں صد فیصد درست ہیں۔ درحقیقت امام ابوحنیفہؒ قانونی ایمان سے متعلق بات کہہ رہے ہیں جبکہ امام بخاریؒ حقیقی ایمان کے حوالہ سے اپنی رائے پیش کر رہے ہیں۔ قانونی ایمان کے اعتبار سے یہ بات صد فیصد درست ہے کہ یہ صرف قول ہے اور اس کے ضمن میں عمل زیرِ بحث نہیں آتا۔ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی نہ کرنے والا کافر نہیں ہو جاتا‘ البتہ اگر ان کا انکار ہی کر دے تو پھر کافر کہلائے گا۔ قانونی ایمان جس پر کفر اور اسلام کا دارومدار ہے‘ اس کی بنیاد محض قول پر‘ ماننے پر یعنی اقرار باللسان پر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا۔ پس تکفیر اور شے ہے جبکہ فسق و فجور الگ شے ہے‘ جن کے درمیان حدِ فاصل انسان کا اقرار باللسان ہے۔ البتہ حقیقی ایمان کے حوالہ سے زمین آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ اگر ایمان دِل میں اُتر جائے تو لازماً عمل پر بھی اثر انداز

ہو گا۔ دل میں جیسا یقین ہوتا ہے‘ عمل اُسی کے مطابق ہو گا۔ ہمارا یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے تو کوئی شخص بھی جان بوجھ کر اس میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ دنیا کے معاملات میں یقین تو کیا‘ اگر ہمیں گمان بھی ہو تو اس کا نتیجہ ہمارے عمل میں نظر آتا ہے۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن کوئی بھی سانپ ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا: ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں‘ یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یقین واقعتاً بہت اہم چیز ہے۔ یہ اگر پیدا ہو جائے تو انسان توکّل‘ راضی برضائے رب‘ زوالِ خوف وحُزن کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا رب ہی میرا محافظ ہے۔ اگر اُس نے ہی میرے لیے کچھ لکھ دیا ہو تو پھر بچانے والا کوئی نہیں۔ ہم اُس کی طرف سے مقرر کردہ کسی چیز سے بھاگ ہی نہیں سکتے۔ بھاگیں بھی کیوں؟ وہ اللہ تو ہمارا اصل محبوب ہے۔ اُس کی رضا جس چیز میں ہے‘ اس کے لیے تو ہم حاضر ہیں‘ کیونکہ اس کی طرف سے آنے والے ہر فیصلہ میں خیر ہی خیر ہے۔ سو کسی غم یا خوف کا کوئی مقام ہو ہی نہیں سکتا۔

﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس)

’’آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

دراصل اگر دل میں یقین ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اس کے حضور حاضری دینی ہے تو انسان گناہ کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتا۔ غفلت کے پردوں کی وجہ ہی سے یقین زائل ہوتا جاتا ہے اور پھر انسان سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی چوراہے پر ٹریفک سارجنٹ کھڑا ہو تو ہم گاڑی کو بالکل صحیح جگہ پر روکیں گے‘ ورنہ عموماً دائیں بائیں دیکھ کر گاڑی نکال لیتے ہیں۔ پس اگر یہ یقین ہو کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو اس کا قانون ہرگز توڑا نہیں جا سکتا۔ یقین والے ایمان کے ساتھ معصیت ممکن ہی نہیں۔ قانونی ایمان کے ساتھ معصیت کے ڈھیر بھی ہو سکتے ہیں لیکن حقیقی ایمان اور معصیت اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ ہماری

اُمّت کی اکثریت کا حال یہی ہے کہ قانونی ایمان کے باوجود معصیت کے انبار ہیں۔ اسی لیے وہ الفاظ آتے ہیں کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصف)

''اے ایمان والو! تم وہ کہتے کیوں ہو جو تم کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک سخت ناپسند ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔''

حقیقی ایمان کے ساتھ معصیت کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اس حوالہ سے کچھ احادیثِ مبارکہ پر غور کرتے ہیں:

متفق علیہ حدیث ہے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک مرتبہ تین بار قسم کھا کر فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قِيْلَ: وَمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلَّذِيْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَايِقَهُ))

''اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں' اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں' اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں!'' عرض کیا گیا: کون اے اللہ کے رسول؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں۔''

ہم تو اس کو شاید کبیرہ کیا' صغیرہ گناہ بھی نہ سمجھتے ہوں' زیادہ سے زیادہ بداخلاقی شمار کریں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تین بار قسم کھا کر ایسے شخص کے ایمان کی نفی فرما رہے ہیں۔ پس ایمان اور عملِ صالح کا علیحدہ ہونا ممکن ہی نہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو تقریباً دس برس حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ خادمِ خاص کے طور پر رہے' روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شاید ہی کوئی خطبہ دیا ہو جس میں یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں:

((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ)) (مشکاۃ المصابیح:۳۵)

''جس شخص میں امانت داری نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں' اور جس میں ایفائے عہد

نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔‘‘

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے‘ حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ))

’’کوئی شخص حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا‘ کوئی شخص حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا‘ کوئی شخص حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا۔‘‘

گویا ایمان اور اخلاق لازم وملزوم ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایمان انسان کے کردار پر اثر انداز نہ ہو اور عمل میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ یہاں پر مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید یہ قانونی ایمان کی بات ہو رہی ہے‘ جبکہ درحقیقت یہ حقیقی ایمان (قلبی یقین) کا ذکر ہے۔ اگر قانونی ایمان کی بات ہو تو ایسے گناہوں کا مرتکب کافر قرار پائے گا‘ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قانونی ایمان کا دارومدار محض قول پر ہے۔ گناہ اسی وقت سرزد ہوتا ہے جب حقیقی ایمان دِل سے نکل جائے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کا ایمان دل سے نکل کر اُس کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے‘ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو ایمان واپس آجاتا ہے ورنہ رخصت ہو جاتا ہے۔

## دو انتہائیں

اس معاملہ میں دو انتہاؤں سے اپنے آپ کو بچانا بہت ضروری ہے۔ ایک انتہا پر خوارج تھے جنہوں نے ایسی احادیث کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر دیا کہ جس کے پاس ایمان نہیں‘ وہ کافر ہے۔ پھر وہ ایسے کافر کو مرتد ٹھہراتے اور واجب القتل قرار دے دیتے۔ یہ بہت بڑی غلطی‘ بہت بڑی گمراہی تھی۔ دوسری طرف یہ انتہا ہے کہ جنت ودوزخ اور آخرت کے فیصلے قانونی اسلام ہی کی بنیاد پر کر دیے جاتے ہیں‘ حالانکہ قانونی اسلام دنیا کے فیصلوں کے لیے مفید ہے جبکہ آخرت میں تو قلبی یقین والا ایمان ہی مفید ہوگا۔ ہم اہلِ سُنّت عوام کی اکثریت کے ذہن میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو صاحبِ ایمان بھی

ہیں‘ اور اسی بنیاد پر جنت ہم پر واجب جبکہ دوزخ ہم پر حرام ہے۔ جب دل میں یہ سوچ ہوگی تو اس کے بعد کوئی کیوں گناہ گاری‘ حرام خوری‘ بد دیانتی سے بچے گا؟ ذہن میں تو جنت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر ہی لیا ہے۔ یہ اصل میں مُرجئہ کا عقیدہ تھا۔ سو اِن دونوں غلطیوں سے بچنا بہت ضروری ہے۔

اسی طرح اہلِ تشیع نے غلطی کی کہ ایمان اور اسلام کے فیصلے دنیا میں کرنے لگے جس کا اختیار کسی کو نہیں۔ دُنیا میں قانونی سطح پر صرف مسلم اور کافر کی تقسیم ہی ممکن ہے‘ کوئی تیسری قسم نہیں بنائی جاسکتی۔ دنیا میں کوئی شخص یا تو مسلمان کہلائے گا یا کافر۔ اب یہ مسلمان یا تو مؤمن ہوسکتا ہے یا منافق‘ لیکن دنیا میں کسی کو بھی منافق نہیں کہا جاسکتا‘ وہ تو آخرت میں ہی ثابت ہوسکے گا۔ حضور ﷺ نے بھی کسی شخص کے بارے میں یہ اعلان نہیں فرمایا کہ وہ منافق ہے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن اُبی جیسے شخص کی بھی نماز جنازہ پڑھائی‘ گویا آخری وقت تک اس کو مسلمان تسلیم کیا۔ ایک مسلمان کے قانونی حقوق کے لحاظ سے منافق بھی مسلمان ہی ٹھہرایا جائے گا۔ اس بات کی وضاحت ایک گراف سے کی جاسکتی ہے۔ ایک خطِ مستقیم کے درمیان میں زیرو ہے‘ دائیں طرف مثبت اعداد اور بائیں جانب منفی اعداد لکھے ہیں۔ مثبت اعداد ایمان کے درجات کو ظاہر کر رہے ہیں‘ جن کی انتہائی شکل (infinity) کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کا درجہ سمجھا جائے گا۔ اسی طرح منفی اعداد نفاق کے درجات کو ظاہر کر رہے ہیں‘ جس کا انتہائی درجہ عبداللہ بن اُبی کا ہوگا۔ درمیان میں جو زیرو ہے‘ وہ دراصل تیسری شکل ہے‘ یعنی ایک مسلمان شخص جو مومن اور منافق کے درمیان کی کیفیت میں ہو۔ اگر ظاہر میں اسلام‘ باطن میں ایمان ہو تو یہ مطلوب کیفیت ہے۔ اگر ظاہر میں اسلام‘ باطن میں نفاق ہو تو یہ منافق کی کیفیت ہے۔ اگر ظاہر میں اسلام‘ باطن میں نہ ایمان اور نہ نفاق ہو تو یہ شخص محض مسلم ہے جو کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کی کیفیت ہے‘ اِلا ماشاء اللہ۔ یعنی ایسی کیفیت کہ بباطن نفاق تو نہ ہو لیکن حقیقی ایمان بھی نہ ہو۔ اگر حقیقی ایمان موجود ہوگا تو عمل میں ضرور نکھار آئے گا۔ پس ہم میں سے اکثر کا ایمان بھی مومن اور منافق کے درمیان جیسا ہی ہے۔ منافقانہ طرزِ عمل تو نہیں لیکن ایمانی

کیفیات بھی پوری طرح نظر نہیں آتی ہیں۔

زیرِ مطالعہ آیت جس سے گفتگو کا آغاز کیا گیا تھا‘ اس کے مخاطب بھی ایسے ہی لوگ ہیں۔ اس آیت میں کچھ لوگوں کے ایمان کی نفی کی جا رہی ہے ﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا﴾ یعنی مثبت طور پر ایمان موجود ہونے کی نفی کی جا رہی ہے۔ ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ’’لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے‘‘ یعنی درمیان میں جو اسلام کی حالت ہے اس کا اقرار کیا جا رہا ہے۔ ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ ’’اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔‘‘ ایمان کے دلوں میں داخل نہ ہونے کی مزید تاکید ہوگئی۔ آگے فرمایا گیا:

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْــــًٔا ۭ﴾

’’(اگرچہ تاحال تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا لیکن) اس حال میں بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔‘‘

گویا یہاں پر منافق کا ذکر نہیں کیا جا رہا‘ کیونکہ منافق کا تو کوئی عمل قبول ہی نہیں۔ نفاق تو منفی کیفیت ہے۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ ﷺ کی امامت میں نمازیں پڑھیں لیکن ان کے قبول ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس کی موت پر اُس کے صالح بیٹے عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی‘ جو ایک مؤمن صادق صحابی تھے‘ نے باپ کی محبت کی وجہ سے حضور ﷺ سے کُرتا مانگا تاکہ اس میں اپنے باپ کو کفن دے سکیں۔ حضور ﷺ نے اپنا کرتا عنایت فرمادیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اعتراض ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’عمر! میرا کُرتا اسے اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔‘‘

## قانونی ایمان کی تین حالتیں

بہرحال‘ اگر قانوناً ایک شخص مسلمان ہے تو حقیقت کے اعتبار سے اس کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

(i) مثبت طور پر مومن ہوگا۔

(ii) منفی طور پر منافق

(iii) دل میں نہ نفاق ہو اور نہ ہی ایمان‘ محض مسلمان ہو جس کے بارے میں زیر مطالعہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اگر تم اطاعت کی روش پر قائم رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کرے گا یعنی تم کو اجر و ثواب سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ ایمان کے بغیر بھی عمل قبول کر لیا جائے۔ قرآن حکیم کی آیات عموماً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ایسے اسماء و صفات پر ختم ہوتی ہیں جن کی مضمون کے ساتھ ضرور کوئی مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں آیت کے اختتام پر ''غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'' کے الفاظ آئے ہیں‘ گویا یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شانِ غفاری ورحیمی کا مظہر ہے کہ حقیقی ایمان نہ ہونے کے باوجود اگر اطاعت کرتے رہو گے تو بھی وہ اجر و ثواب عطا فرمائے گا‘ ورنہ منطقی بات تو یہی ہے کہ ایمان کے بغیر اطاعت قبول نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت بڑی نویدِ جاں فزا ہے کہ وہ اس حالت میں کی گئی اطاعت قبول فرمائے گا۔ البتہ اس حوالہ سے چار اہم نکات کو سمجھنا ضروری ہے۔

اس آیت کے اوّلین مخاطب کون لوگ تھے؟ مکہ میں اسلام کمزور تھا‘ کفر غالب تھا۔ جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تو اس کو شدید ذہنی و جسمانی تشدد کا سامنا ہوتا۔ پس اُس وقت وہی شخص کلمہ شہادت پڑھتا جس کے دل میں یقین کامل پیدا ہو چکا ہوتا تھا۔ تبھی وہ اس کلمہ کے نتیجہ میں آنے والے مصائب پر ثابت قدم رہتا۔ اس کا ایمان ایسا ہوتا کہ جیسے اس کو جنت اور دوزخ سامنے نظر آ رہے ہوں۔ ایک روز فجر کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے ایک انصاری صحابی سے جب پوچھا: كَيْفَ اَصْبَحْتَ يَاحَارِثَةُ؟ ''اے حارثہ! تم نے آج کیسی صبح کی؟'' تو انہوں نے غیر معمولی جواب دیا: اَصْبَحْتُ مُؤمِنًا حَقًّا ''میں نے حقیقی ایمان کی حالت میں صبح کی ہے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''دیکھ لو تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہر بات کی ایک حقیقت ہوتی ہے (تمہارے ایمان کی کیا کیفیت ہے؟)'' انہوں نے کہا کہ گویا میں اپنے ربّ کے عرش کے سامنے ہوں‘ جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور جہنم میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یعنی یقین کامل کی

کیفیت میں تھے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَبْصَرْتَ فَالْزَم)) ''تم نے (عالمِ آخرت کا) مشاہدہ کرلیا ہے' اس حالت کو لازم پکڑو۔'' پھر دوسروں کو مخاطب کر کے فرمایا: ((عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ الْاِیْمَانَ فِیْ قَلْبِهٖ)) ''یہ ایسا بندہ ہے کہ اللہ نے اس کے دل میں ایمان کو روشن کر دیا ہے۔'' حدیثِ جبریلؑ میں بھی جب حضور ﷺ سے احسان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے یہی فرمایا کہ اللہ کی بندگی اِس طرح کرو جیسے تم اُسے دیکھ رہے ہو' اگر یہ نہ ہو تو کم از کم یہ سوچو کہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بہر حال مکّہ میں ایمان لانے والوں کی یہ کیفیت تھی کہ پہلے ایمان جبکہ اسلام بعد میں۔ مدینہ میں آ کر یہ صورتِ حال بدلنا شروع ہوئی' کیونکہ وہاں اگر کسی قبیلہ کا سردار ایمان لے آتا تو سب اسلام لے آتے۔ ان کے دل میں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جو یقین درکار ہے' وہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ مدینہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو یقین کامل کے بعد ہی اسلام لاتے تھے۔ اسی بات کو یوں کہا گیا:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝۱ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾

''جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح حاصل ہوگئی۔ اور آپ نے لوگوں کو فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔''

اب جو لوگ ایمان لائے ان میں سے اکثر میں کوئی منفی پہلو نہیں تھا' لیکن مثبت طور پر یقین والی کیفیت بھی نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے بھی یہ رعایت دی جا رہی ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ..........﴾

ہمارا حال اکثر و بیشتر اسی آیت کا مصداق ہے۔ اپنی حالت پر غور کریں تو ہمارے ہاں وراثتی مسلمان (by birth) کا سلسلہ چل رہا ہے۔ ہم میں سے اکثر نے غور و فکر کر کے ایمان قبول نہیں کیا۔ البتہ اب بھی شعوری ایمان کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے' کیونکہ نسل در نسل مسلمان ہو جانے کی وجہ سے اسلام تو آ جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ایمان بھی ہو۔

## جزوی اطاعت قابلِ قبول نہیں!

ہمارے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے فضل سے حقیقی ایمان کے بغیر بھی ہماری اطاعت کو قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم پر اس قدر رحمت فرمائی کہ اس حالت میں بھی اطاعت کرو گے تو اللہ نیک اعمال کا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔ تاہم‘ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو اطاعت مطلوب ہے وہ کُلی ہے‘ جزوی نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دس احکامات میں سے پانچ مان لیے اور پانچ سے چشم پوشی اختیار کر لی تو یہ جزوی اطاعت کہلائے گی اور اس پر تو اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔ جزوی اطاعت دراصل اطاعت ہے ہی نہیں۔ یہ تو تمسخر‘ ڈھٹائی‘ استہزاء (مذاق اُڑانا) کہلائے گی۔ سورۃ البقرۃ میں یہود سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾﴾ (البقرۃ)

’’کیا تم اللہ کی کتاب (اور اس کی شریعت) کے کچھ حصوں کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو؟ تو جو کوئی تم میں سے اس طرزِ عمل کا مرتکب ہو اس کی سزا دنیا کی ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ اور قیامت کے روز انہیں شدید ترین عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔‘‘

حدیث نبوی کے مطابق اللہ تعالیٰ ہماری صورتوں اور اموال کو نہیں دیکھتا بلکہ ہمارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَمْوَالِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ)) (صحیح مسلم: ۶۵۴۳)

اگر اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام مانے جا رہے ہوں اور کچھ احکام کی جانب مستقل بے توجہی ہو تو جو مانے جا رہے ہیں کیا اس لیے کہ وہ نفس کے لیے آسان ہیں اور جو نہیں مانے جا رہے وہ کیا اس لیے کہ وہ نفس کو پسند نہیں؟ دونوں صورتوں میں نفس ہی کی اطاعت ہوئی۔ ایسی

صورت میں بظاہر اللہ کا کوئی حکم مانا بھی جا رہا ہو تو حقیقت میں نفس کی اطاعت ہی کی جا رہی ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ کی بات ماننا مقصود ہو تب تو سارے ہی احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ پس مطلوب یہی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کُلی اطاعت کی جائے‘ اُس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ وقتی طور پر خطا ہو جانا‘ جذبات کی رَو میں کوئی غلطی ہو جانا ایک الگ بات ہے۔ ایسا ہو جائے تو انسان فوراً توبہ کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ قرار دیا ہے جو کبھی جہالت‘ نادانی یا جذبات میں گناہ کر بیٹھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ﴾ (النساء:۱۷)

’’اللہ کے ذمہ ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں‘ پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں‘ تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔‘‘

اس کے برعکس جان بوجھ کر‘ سوچ سمجھ کر گناہ کرنا‘ مثلاً یہ کہنا کہ آج کے دور میں سود کے بغیر کاروبار کرنا ممکن نہیں‘ یہ محض جذباتی بات نہیں بلکہ سوچی سمجھی رائے ہے۔ اگر اس طرزِ عمل پر مستقل قائم رہے تو یاد رہے کہ ایسا ایک گناہ ساری نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے:

﴿بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ (البقرۃ)

’’کیوں نہیں‘ جس شخص نے جان بوجھ کر ایک گناہ کمایا اور اُس کا گھیراؤ کر لیا اُس کے گناہ نے‘ پس یہی ہیں آگ والے‘ وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

جان بوجھ کر کسی ایک بھی بڑے گناہ کو مستقل طور پر اپنی زندگی میں قائم کر لینا اپنے تمام اعمال کی تباہی ہے۔

## حاصلِ کلام

بہر حال‘ سورۃ الحجرات (آیت ۱۴) کے بارے میں چار اہم باتیں ہمارے

سامنے آگئیں:

(۱) یہ آیت مدینہ میں اسلام لانے والے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔
(۲) یہ آیت صد فیصد ہم پر منطبق ہوتی ہے۔
(۳) اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس حال میں بھی اُس نے ہماری اطاعت کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔
(۴) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو کُلی اطاعت مطلوب ہے' جزوی نہیں۔

آخر میں امام بخاریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اقوال کے حوالے سے پھر گفتگو کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَلَا یَزِیْد وَلَا یَنْقُصُ ''ایمان قول کا نام ہے' اور یہ نہ بڑھتا ہے اور نہ ہی گھٹتا ہے۔'' دوسری طرف امام بخاریؒ کا قول ہے: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَ عَمَلٌ یَزِیْدُ وَ یَنْقُصُ ''ایمان قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے' یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔''

اِن دونوں باتوں میں بظاہر تضاد نظر آ رہا ہے لیکن درحقیقت یہ دونوں صد فیصد درست ہیں' کیونکہ امام ابوحنیفہؒ دراصل قانونی ایمان کے بارے میں رائے دے رہے ہیں جس کی بنیاد پر اسلام اور کفر کے فیصلے ہوتے ہیں جبکہ امام بخاریؒ حقیقی ایمان کے حوالہ سے اپنی رائے پیش کر رہے ہیں جس کی بنیاد پر آخرت میں فیصلہ ہوگا۔

قانونی ایمان کی بنیاد پر کسی شخص کو دنیا میں مسلمان کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً اسلامی ریاست میں ووٹ کا حق' اسلامی ملک کا اہم عہدے دار بننا' مسلمان عورت کا مسلمان مرد سے نکاح ہونا' مسلمان باپ کی وراثت کا حق دار ہونا وغیرہ۔ ان معاملات میں ہر مسلمان کا قانونی حق برابر رہتا ہے چاہے وہ متقی ہو یا فاسق و فاجر۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جو ایک نماز پڑھتا ہو اسے ایک ووٹ کا حق ملے اور جو پانچ نمازیں پڑھتا ہو' اس کو پانچ ووٹ کا حق حاصل ہو جائے' اور جو تہجد پڑھتا ہو وہ دس ووٹ دے سکے۔ قانونی status یقیناً جامد ہے' نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ تکفیر کا معاملہ الگ ہے' ورنہ قانونی لحاظ سے متقی و فاسق سب برابر کے حصہ دار ہیں۔ اگر بالفرض حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن اُبی

ایک ہی باپ کے بیٹے ہوتے تب بھی وراثت میں برابر حصہ پاتے۔اس اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کا قول بالکل درست ہے کہ قانونی ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ ہی گھٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو گہرا قانونی فہم عطا فرمایا تھا جس کا کوئی ثانی نہیں۔

اس کے برعکس امام بخاریؒ کا قول کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے‘ حقیقی ایمان کے اعتبار سے بالکل درست ہے۔ یہ تو قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے: ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ (الانفال:۲) ’’اور جب انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔‘‘ ﴿لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ﴾ (الفتح:۴) ’’تا کہ وہ اضافہ کرلیں اپنے ایمان میں مزید ایمان کا۔‘‘ ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾﴾ (الاحزاب) ’’اور اس (واقعہ) نے ان میں ایمان اور فرماں برداری ہی کا اضافہ کیا۔‘‘ یعنی ایمان کی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ بھی ہے کہ اگر کسی صاحبِ ایمان کے پاس بیٹھیں گے تو لازماً اپنے اندر ایمان کی حرارت میں اضافہ ہوگا‘ دین کی لگن اور جذبہ بڑھے گا۔ ایک حدیث کا مفہوم بھی ہے کہ اللہ کے دوست وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔ آوارہ‘ فحش گو‘ لطیفہ گو لوگوں کے پاس بیٹھنے سے ایمان میں کمی آتی ہے۔ قرآن پڑھنے سے یقیناً ایمان میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ فحش ناول پڑھنے سے ایمان میں لازماً کمی ہوتی ہے۔ قلب کا مطلب ہی بدلنا ہے‘ انقلاب کا مطلب نظام کی تبدیلی۔ قلب کو کسی حالت پر قرار نہیں ہوتا۔ انسان کے جسم کا ہر حصہ (دماغ‘ گردے‘ معدہ) آرام کر لیتا ہے لیکن دل کے لیے آرام نہیں‘ اس کو کسی لمحہ قرار نہیں۔ دل اگر کام کرنا چھوڑ دے تو یہ موت کی کیفیت ہوگی۔ اسی طرح قلبی ایمان ہر لحظہ گھٹ رہا ہوتا ہے یا بڑھ رہا ہوتا ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم بھی ہے کہ جس شخص کے دو دن برابر ہو گئے‘ وہ نقصان میں رہا۔ یعنی جتنا ایمان آج ہے‘ اتنا ہی اگلے دن بھی رہا تو یہ خسارہ ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے کہ نفع نہ ہو سکا بلکہ کمی واقع ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اگلا دن تو اس لیے دیا تھا کہ ایمان کی پونجی میں اضافہ ہو سکے۔ یہی بات سورۃ العصر میں فرمائی گئی: ﴿وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿٢﴾﴾

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

پس ثابت ہوا کہ امام بخاریؒ اور امام ابوحنیفہؒ دونوں کے اقوال بالکل درست ہیں۔

دراصل ایمان اور عمل صالح ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) کی طرح لازم وملزوم ہیں‘ جن کو علیحدہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایمان اور عملِ صالح کا ذکر ہمیشہ جوڑے کی شکل میں آیا ہے۔ مثلاً:

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ۶﴾ (التین)

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪۳﴾ (العصر)

’’تواصی بالحق‘‘ اور ’’تواصی بالصبر‘‘ بھی اپنی اپنی جگہ پر نیک عمل ہیں‘ یعنی عمل صالح ہی میں شامل ہیں‘ لیکن ان کی اہمیت کی وجہ سے سورۃ العصر میں ان کا ذکر الگ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کہ نجات کے لیے محض ایمان کافی ہے۔ البتہ وہ نجات مراد ہوسکتی ہے جو دوزخ کی شدید آگ میں اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد وہاں سے نکال لینے کی صورت میں ہو۔ وہ نجات کہ جس کے بارے میں جہنم کی آگ سے بچا لینے کا میدانِ حشر ہی میں اعلان کر دیا جائے: ﴿فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ فَقَدۡ فَازَ ؕ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) ’’تو جو کوئی بچا لیا گیا جہنّم سے اور داخل کر دیا گیا جنّت میں تو وہ کامیاب ہوگیا‘‘ وہ کامیابی محض ایمان سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے عمل صالح بھی انتہائی ضروری ہے۔ پس ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں‘ جن کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس موضوع سے متعلق احادیثِ مبارکہ بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

❁❁❁

# مفتی طارق مسعود اور شجاع الدین شیخ کا مکالمہ

## تنظیمِ اسلامی کی جدّ و جہد اور نظم

مفتی طارق مسعود صاحب نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ تقریباً دس پندرہ سال قبل نارتھ کراچی میں نوجوان انہیں بتایا کرتے تھے کہ وہ جمعہ جناب شجاع الدین شیخ کے ہاں پڑھنے جاتے ہیں۔ ان کے بیانات بہت معلوماتی اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ تب سے ان کے دل میں شجاع الدین شیخ کے لیے محبت بیٹھ گئی تھی کہ ماشاء اللہ ایک مؤثر کام کر رہے ہیں۔ بعد میں معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ وہ تنظیم اسلامی سے وابستہ ہیں اور بے حیائی' سود اور آزادئ نسواں (feminism) جیسے مسائل کے خلاف ان کا کام نمایاں ہے۔ مفتی صاحب نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا تعارف' تعلیمی پس منظر' ڈاکٹر اسرار احمد علیہ الرحمۃ سے تعلق' اور تنظیم اسلامی میں شمولیت کے بارے میں بتائیں۔

### ابتدائی زندگی اور تعلیمی پس منظر

شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ ان کی رہائش کراچی کے قدیم علاقے برنس روڈ میں رہی ہے' اور یہیں ان کی پرورش ہوئی۔ انہوں نے کامرس کی تعلیم حاصل کی اور چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کی فیلڈ میں پاکستان کی معروف فرم ایئر فرگوسن سے ٹریننگ مکمل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامیات) بھی کیا۔ اسکول میں چند اساتذہ ایسے ملے جنہوں نے انہیں عربی سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ کالج کے دور میں انہوں نے مفتی تقی عثمانی' مفتی رفیع عثمانیؒ اور مفتی عبدالرؤف سکھرویؒ جیسی جید شخصیات سے استفادہ کیا۔ مفتی زرولی خانؒ کا دورۂ تفسیر بھی ان کے لیے فیض رساں رہا۔

### ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے تعلق اور تنظیم اسلامی میں شمولیت

انہوں نے ۹۲-۱۹۹۱ء سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو سننا شروع کیا اور ۱۹۹۸ء میں تنظیم اسلامی

میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی۔ مفتی طارق مسعود کے اس سوال پر کہ کیا داڑھی شروع سے رکھی تھی، انہوں نے بتایا کہ الحمدللہ شروع سے ہی داڑھی ہے اور کبھی صاف کرنے کا موقع نہیں آیا۔ اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد اور دادا دونوں پاکستان کسٹمز میں تھے اور انتہائی درجے کے ایماندار تھے۔ دین کی طرف آنے کی توفیق ملنے میں والدین کی تربیت اور حلال رزق کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شجاع الدین شیخ نے اپنے علمی سفر میں چند دیگر اہم شخصیات کا بھی ذکر کیا۔ ان کے محلے میں ایک استاد تھے جو بیک وقت جماعتِ اسلامی سے بھی وابستہ تھے اور جام شورو کے ایک بزرگ کے ساتھ تصوف کے حوالے سے بھی وابستہ تھے۔ اسی طرح مفتی نظام الدین شامزیؒ نے دس سال تک ان کے محلے میں درس دیا جس میں شرکت کا انہیں موقع ملا۔ ان تمام اساتذہ سے استفادہ کا تعلق رہا۔

## تنظیم کی جدّوجُہد کے مرکزی دائرے

مفتی طارق مسعود نے ابن تیمیہؒ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ حق اور باطل کا اندازہ باطل کے تیروں کے رخ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں دو چیزوں کو فوکس کر رہی ہیں: سودی نظام اور بے حیائی۔ ان کا کہنا تھا کہ تنظیم اسلامی کا ان دونوں میدانوں میں کام نمایاں ہے۔ وہ شجاع الدین شیخ سے اس لیے عقیدت رکھتے ہیں کہ ان کا کام صرف باتوں تک محدود نہیں بلکہ سائن بورڈز، مظاہروں اور تقریروں کی صورت میں ان کا کام سامنے آتا رہتا ہے۔

شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ تنظیم اسلامی کی جِدّوجُہد کے مرکزی دائرے یہ ہیں:

- معاشرت کی سطح پر بے حیائی کے خلاف مہم
- معیشت کی سطح پر سود کے خلاف کام
- سیاست کی سطح پر سیکولرازم کے خلاف محنت

ہر تین ماہ بعد پورے پاکستان میں ''منکرات آگاہی مہم'' چلائی جاتی ہے جس میں عوامی سطح پر گفتگو کی جاتی ہے اور لٹریچر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ مہمات کبھی معیشت پر، کبھی معاشرت پر، کبھی سیاست پر مرکوز ہوتی ہیں۔ ججز، وکلاء، اسمبلی ممبران، صدر اور وزراء سب کو لٹریچر بھیجا جاتا ہے اور انہیں ان کی دینی ذمہ داری یاد دلائی جاتی ہے۔

ختم نبوت جیسی تحریک کا حوالہ دیتے ہوئے شجاع الدین شیخ نے کہا کہ جب تک ایسا پبلک پریشر نہیں ڈالیں گے‘ منکرات کے خلاف بات بننے والی نہیں ہے۔ انہوں نے مفتی تقی عثمانی کا ۲۰۱۸ء کا کلپ یاد کروایا جس میں حضرت نے فرمایا تھا کہ انگریز کے دور سے حکومتوں کو یہ بات سمجھ آگئی ہے کہ جب تک کوئی ’’جوتا لے کر نہیں آئے گا‘‘ بات نہیں ماننی۔ شجاع الدین شیخ نے واضح کیا کہ پریشر ڈالنے کا مطلب توڑ پھوڑ یا گاڑیاں جلانا نہیں بلکہ عوامی دباؤ اور مزاحمت کا ماحول قائم کرنا ہے۔

مفتی طارق مسعود نے عدالتی خلع کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس نے فیملی سسٹم تباہ کر دیا ہے جبکہ نہ منبر سے اس پر بات ہو رہی ہے نہ اسلامی نظریاتی کونسل اس پر سوچ رہی ہے۔ شجاع الدین شیخ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ تحریک کسی ’’متفق علیہ منکر‘‘ کے خلاف چلنی چاہیے۔ شراب‘ جوا‘ سود‘ بے حیائی جیسے مسائل پر کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

## دعوت کا طریقہ کار اور نئی نسل کی شمولیت

مفتی طارق مسعود نے پوچھا: تنظیم اسلامی نوجوانوں کو کیسے راغب کرتی ہے اور جدّوجُہد کا حجم کیسے بڑھاتی ہے؟ شجاع الدین شیخ نے پہلے تبلیغی جماعت کے حضرات کی محنت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ علمی اختلافات اپنی جگہ لیکن ان کی قربانیاں قابلِ تعریف ہیں۔ تنظیم اسلامی میں دعوت کے حوالے سے انہوں نے دو بنیادی نکات بیان کیے:

(۱) ’’قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا‘‘ (التحریم) کے تحت پہلی ذمہ داری اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ دعوت کی بات باقی تمام جگہوں پر تو ہو رہی ہوتی ہے لیکن اکثر اپنے گھر والے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم پہلے اپنے بچوں اور بچیوں پر توجہ دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔

(۲) ہر ساتھی کو بتایا جاتا ہے کہ مدرس اور خطیب تو ہر کوئی نہیں بن سکتا لیکن داعی ہر ایک کو بننا ہے۔ کالج ہو‘ یونیورسٹی ہو‘ یا پیشہ ورانہ زندگی ہو‘ دعوت کا کام ہر جگہ جاری رکھنا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بیانات کی مقبولیت بھی ایک مثبت اور موثر کردار ادا کرتی ہے۔ ہر اردو بولنے والا جو دین سننا چاہتا ہے وہ ڈاکٹر صاحبؒ کو سنتا ہے‘ جس سے ہمارے لیے گفتگو کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ تاہم اصل چیز مستقل محنت‘ ذاتی رابطہ‘ دروس میں

شرکت کی ترغیب دینا ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کی خوشی اور غم میں ان کے ساتھ شریک ہونا ہے‘ کیونکہ اگر ہمدردی کا جذبہ نہ ہو تو اگرچہ داعی کا ٹیگ لگ جائے گا لیکن بات دوسرے کے دل میں نہیں اُترے گی۔

## مدرّس بننے کے معیارات

دریافت کیا گیا: تنظیم اسلامی میں درس دینے کے لیے کیا معیارات ہیں‘ کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ وہاں ہر ایک کو درس کی اجازت نہیں ہوتی؟ شجاع الدین شیخ نے اس سوال کو بہت اہم قرار دیتے ہوئے تفصیل سے بتایا کہ تنظیم اسلامی میں درس دینے کے لیے چار بنیادی معیارات ہیں:

(۱) تنظیم میں شامل ہونے والے کو پہلے ’’ملتزم‘‘ کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے یعنی وہ پختہ کار ہو جائے۔

(۲) تجوید کے امتحان سے گزرنا ہوتا ہے جس میں لحن جلی کی غلطیوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ ٹیسٹ مقامی سطح پر لیکن مرکزی نظم کے تحت ہوتا ہے۔

(۳) عربی گرامر کا امتحان بھی مرکز کے تحت پورے پاکستان میں ہوتا ہے۔ اس میں ۸۰ فیصد نمبر حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۴) مدرّسین کے لیے سالانہ تربیتی نشستیں ہوتی ہیں جن میں فہمِ قرآن کے آداب‘ اصولِ تفسیر‘ اصولِ حدیث‘ معروف تفاسیر کا تعارف‘ تفسیر بالرائے سے اجتناب جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔

شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ ان کی تجوید بچپن ہی سے بہتر تھی اور انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی قائم کردہ قرآن اکیڈمیوں میں ہونے والے دس ماہ کا ’’رجوع الی القرآن‘‘ کورس بھی کیا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ تنظیم میں شامل ہوئے تو مذکورہ معیارات پر پورا اترنے کی وجہ سے انہیں فوراً ہی درس کی ذمہ داری مل گئی تھی۔

مفتی طارق مسعود نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے جاندار اور انذار پر مبنی انداز کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا ان کا انداز بھی وہی ہے! شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے چہرے پر جو جلال اور رعب تھا وہ اُمت کے بگاڑ اور منکرات کے بڑھتے چلے جانے پر ان کے

رنج کا عکاس تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ سے ذاتی طور پر ملنے والے جانتے ہیں کہ وہ بالکل مختلف شخصیت تھے۔ نجی محافل میں وہ ایسی سخت گفتگو نہیں کرتے تھے' بلکہ حسبِ موقع مذاق اور لطیفہ گوئی کا معاملہ بھی ہوتا تھا۔ شجاع الدین شیخ نے کہا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے بعد ان کے صاحب زادے حافظ عاکف سعید بالکل برعکس شخصیت تھے۔ انتہائی شفقت اور نرمی والے' چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ تھی۔ نتیجے کے طور پر ڈاکٹر صاحبؒ کے شاگردوں میں مزاج کا تنوع پایا جاتا ہے' اور وہ خود بھی بشارت اور انذار دونوں پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

## سیاست سے متعلق پالیسی

تنظیم اسلامی کا ہدف کیا ہے؟ کیا وہ خود سیاست میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں' یا کسی سیاسی جماعت کی حمایت کرتے ہیں؟ شجاع الدین شیخ نے وضاحت کی کہ فرد کا نصب العین رضائے الٰہی اور اُخروی نجات ہے جبکہ تنظیم کا اجتماعی ہدف اقامتِ دین کی جِدّو جُہد ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ تنظیم اسلامی مروجہ انتخابی سیاست میں شامل نہیں ہے۔ البتہ سیاسی گفتگو کرتے ہیں' ملک کے حالات پر کلام کرتے ہیں' اور حکمرانوں تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر تنظیم کا کوئی رفیق کسی کو ووٹ دینا چاہے تو اس کو دو باتوں کی ہدایت دی جاتی ہے:

(۱) جس جماعت کو ووٹ دے رہا ہے' اس کے منشور میں خلافِ اسلام کوئی بات شامل نہ ہو۔

(۲) جس امیدوار کو ووٹ دے رہا ہے وہ ظاہری اعتبار سے کبائر میں مبتلا نہ ہو۔

یہ تنظیم کی طے شدہ پالیسی ہے اور اجتماعی سطح پر کسی جماعت کی براہ راست حمایت نہیں کی جاتی۔ البتہ انہوں نے جنرل مشرف کے دور میں ''متحدہ مجلسِ عمل'' کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے موقف کا بھی ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کو اگرچہ یقین تھا کہ انتخابی سیاست سے نظام نہیں بدلے گا' لیکن جب تمام دینی جماعتیں اکٹھی ہوگئیں تو انہوں نے اس میں اپنا وزن ڈالنے کے لیے شمولیت اختیار کی۔ شجاع الدین شیخ نے کہا کہ اب ایسا امکان نہیں ہے اور اُس دور میں شریعت کے حوالے سے جو پسپائی ہوئی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

## ایک نیا فرقہ بننے کا خدشہ

مفتی طارق مسعود نے ایک اہم سوال اٹھایا کہ دینی مدارس کے بعض طلبہ اور علماء تنظیم اسلامی سے بدگمان رہتے ہیں اور خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں تنظیم کوئی نیا فرقہ بن کر سامنے نہ آجائے۔

انہوں نے بتایا کہ وہ خود بھی اس بدگمانی میں تھے لیکن جب انہوں نے تنظیم کے اداروں کا وزٹ کیا تو بدگمانی دور ہوئی۔

شجاع الدین شیخ نے کہا کہ یہ بدگمانیاں اس وقت تک رہتی ہیں جب تک ملاقاتیں نہ ہوں اور ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش نہ کی جائے۔ انہوں نے ۱۹۹۵ء کا ایک واقعہ سنایا کہ نوجوانی میں وہ اپنے محلے کی مسجد میں ''تفسیرِ عثمانی''، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی ''تعلیم الاسلام'' اور مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی ''معارف الحدیث'' سے کچھ درس دیا کرتے تھے' تو نیو ٹاؤن کے علماء کو شکایت پہنچی کہ کوئی لڑکا وہاں درس دیتا ہے۔ چنانچہ میں وہاں کے علماء سے جا کر ملا تو ایک بزرگ مولوی فضل محمد صاحب نے مجھ پر اطمینان کا اظہار کیا۔

شجاع الدین شیخ نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا حوالہ دیا کہ انہوں نے ۱۹۸۵ء میں فرمایا تھا کہ جب اُمّت میں فتنہ اٹھتا ہے تو پہلا کام یہ کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو اسلاف سے بدگمان کر دیا جائے۔ اسی لیے تنظیم میں مدرّسین کو سمجھایا جاتا ہے کہ ان کا میدان فتوے کا نہیں بلکہ دعوت اور اصلاح کا ہے۔ چنانچہ فقہی مسائل میں وہ علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ماضی میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے خلاف دارالعلوم کورنگی اور جامعہ بنوریہ سے فتوے دیے گئے تھے لیکن آج ان فتاویٰ کا کوئی وجود نہیں اور ان اداروں نے رجوع کر لیا ہے۔ شجاع الدین شیخ نے کہا کہ ڈاکٹر صاحبؒ خود فرماتے تھے کہ فقہی معاملات میں وہ اُمّی ہیں' اور اس کی وضاحت میں فرماتے تھے کہ ''جتنا ان کی اَمّی نے بتایا ہے اتنا جانتے ہیں۔''

## خواتین کی جدّوجُہد اور پردے کا انتظام

کیا کسی سطح پر خواتین کو بھی امیر بنایا جاتا ہے اور کیا وہ درس بھی دیتی ہیں؟ شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ تنظیم میں مرد اور عورت کے دائرہ ہائے کار کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کا نظم محدود رکھا گیا ہے' کیونکہ ان کی اصل ذمہ داری گھر ہے۔ جن خواتین کے بچے چھوٹے ہیں' انہیں باہر کی کوئی ذمہ داری نہیں دی جاتی۔ البتہ جو خواتین گھر کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکی ہیں اور گھر سے اجازت ہے' وہ علاقائی سطح پر ہماری خواتین کی جدّوجُہد میں شریک ہو سکتی ہیں۔ اگر کسی میں صلاحیت ہے تو وہ بیان یا تربیتی نشست کا سلسلہ بھی کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں خواتین کا نظم مَردوں کے نظم کے تابع رکھا گیا ہے۔

قرآن اکیڈمیوں میں جاری کورسز میں خواتین براہِ راست اساتذہ سے بات چیت نہیں کرتیں بلکہ وہ اپنے سوال تحریری طور پر بھیجتی ہیں جن کا جواب دیا جاتا ہے۔ ''رجوع الی القرآن'' کورسز میں خواتین باپردہ شرکت کرتی ہیں۔ جن خواتین میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے انہیں گھروں یا مقامی مراکز کی حد تک درس کا سلسلہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

مفتی طارق مسعود نے کہا کہ اگر بے حیائی ختم کرنی ہے تو عورتوں پر محنت کرنی پڑے گی۔ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے دور اور آج کے دور کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ تب خواتین مسجد نہیں آتی تھیں تو گھروں میں رہتی تھیں، لیکن آج اگر انہیں مسجد میں نہیں لائیں گے تو وہ ٹیلی ویژن اور ڈراموں کے سامنے بیٹھیں گی، یا بازاروں میں جائیں گی۔ انہوں نے کہا کہ بڑی مصیبت کفر والحاد ہے جس سے بچنے کے لیے چھوٹی مصیبت برداشت کرنی چاہیے۔

شجاع الدین شیخ نے اس بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جب نوکری اور تعلیم وغیرہ کے لیے اجازت دی جارہی ہے تو اللہ کے گھر میں آکر قرآن سننے سے روکنا مضحکہ خیز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری محافل میں ایسی خواتین بھی آئیں جو پہلے ماڈلنگ یا فنکاری کرتی تھیں اور پھر اللہ نے ان کی زندگی بدل دی۔ یہ اللہ کے کلام کی برکت ہے اور مفتی منیب الرحمٰن جیسے بزرگ بھی اس رائے کے قائل ہیں کہ اس دور میں عورتوں کے لیے ایسا انتظام ہونا چاہیے تاکہ وہ فضولیات کا رُخ نہ کریں۔

## نکاح میں آسانی کی مہم

مفتی طارق مسعود نے پوچھا کہ انہیں اطلاعات ملی ہیں کہ تنظیم اسلامی بیوہ اور طلاق یافتہ عورتوں کی شادیوں کو بھی فروغ دیتی ہے! شجاع الدین شیخ نے تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے نکاح کو آسان بنانے کی بڑی تحریک چلائی تھی۔ ہمارے معاشرے میں پہلی شادی ہی اتنی مہنگی اور مشکل کر دی گئی ہے کہ دوسری کے متعلق کسی نے کیا سوچنا ہے! انہوں نے خود بھی اپنے ایک بزرگ ساتھی کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ سے نکاح کیا ہے، جن کی ایک شادی شدہ بیٹی (ربیبہ) بھی ہے جو ان کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ترغیب وتشویق کا معاملہ ہے، حکم کی بات نہیں، تاکہ خواتین عفت اور حیا کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

## نصابِ تعلیم میں قرآن حکیم شامل کرنے کی جدّوجُہد

مفتی طارق مسعود نے اپنی ایک پرانی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اپنے اُس منصوبے کے متعلق بتایئے جس کے تحت وہ خیبر پختون خوا میں قرآن حکیم کو نصابِ تعلیم میں شامل کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ یہ کام ''علم فاؤنڈیشن'' کے تحت کیا گیا' جو کراچی کے چند مخلص تاجر حضرات کا قائم کردہ ادارہ ہے۔ یہ نصاب ۲۰۰۹ء میں شروع ہوا اور ۲۰۱۰ء میں پہلا حصہ شائع ہوا۔ ابتدا میں ڈھائی ہزار بچوں کے لیے کراچی کے بائیس اسکولوں میں یہ سلسلہ شروع کیا گیا۔

اس منصوبے کا نام ''مطالعہ قرآن حکیم برائے طلبہ وطالبات'' ہے' جس میں مکمل قرآن کا ترجمہ' تشریح' اخلاقی اسباق اور مشقیں شامل ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں مسلم لیگ (ن) حکومت کے وزیر تعلیم بلیغ الرحمٰن صاحب تک مفتی عدنان کاکاخیل صاحب کے ذریعے یہ بات پہنچی جس کے نتیجے میں فیڈرل گزٹ میں یہ ترتیب آ گئی کہ پہلی سے پانچویں تک ناظرہ قرآن' اور چھٹی سے بارہویں تک قرآن کا ترجمہ پڑھانا ضروری ہے۔

۲۰۱۸ء میں جب کچھ خدشات سامنے آئے تو جناب بلیغ الرحمان نے ''اتحاد تنظیمات مدارس'' (پانچوں وفاق: دیوبند' بریلوی' اہل حدیث' شیعہ' جماعت اسلامی) سے رابطہ کیا۔ ان کے جید علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں شجاع الدین شیخ ''علم فاؤنڈیشن'' کی طرف سے شامل تھے۔ تین سال تک اسلام آباد میں بیس اجلاس ہوئے' جن میں ہر پہلو پر بحث ہوئی۔ بالآخر ۲۸ جنوری ۲۰۲۰ء کو تمام سات حصوں پر سب مکاتبِ فکر نے اتفاق کیا اور دستخط کیے۔

مفتی طارق مسعود نے کہا کہ ایسا اتفاق پاکستان میں شاید ختمِ نبوت والے معاملے کے بعد پہلی بار ہوا ہوگا۔ شجاع الدین شیخ نے تائید کرتے ہوئے بتایا کہ تمام مسالک نے ایک ترجمہ وتشریح پر اتفاق کیا' اور آج تقریباً ۲۳ لاکھ طلبہ یہ نصاب پڑھ رہے ہیں۔ خیبر پختون خوا میں پی ٹی آئی کی حکومت نے اسے اسکولوں میں لاگو کیا۔ پنجاب میں پی ٹی آئی کی حکومت میں اس پر کام شروع ہو گیا تھا' اور اب جبکہ حکومت تبدیل ہو گئی ہے لیکن پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے یہ سلسلہ ترک نہیں کیا اور اب نویں' دسویں' گیارہویں اور بارہویں جماعت کے لیے اس کا لازمی پیپر آنے

والا ہے۔ شجاع الدین شیخ نے کہا کہ جب پیپر لازمی ہو جائے گا تو سب کو پڑھنا پڑے گا۔

مفتی طارق مسعود نے پوچھا: اس نصاب کو منظور کروانے اور اسکولوں کا حصہ بنانے میں کن کن شخصیات کا کردار ہے؟ شجاع الدین شیخ نے سب سے پہلے علم فاؤنڈیشن کے سرپرستوں کا ذکر کیا جو تاجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور انتہائی دین دار لوگ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کراچی شہر کو اللہ نے خیر کے کاموں کے لیے خاص توفیق دی ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء میں انہوں نے مفتی تقی عثمانی‘ مولانا منظور احمد مینگل (وفاق المدارس)‘ مولانا ارشد سعید کاظمی (بریلوی مکتب فکر)‘ مولانا نجیب اللہ طارق (اہلِ حدیث)‘ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن (جماعت اسلامی)‘ اور اہلِ تشیع کی طرف سے جامعہ الکوثر کے نمائندوں کا نام لیا۔ مولانا قاری حنیف جالندھری اور مفتی عدنان کاکاخیل کا بھی تعاون رہا۔ انہوں نے بتایا کہ بلیغ الرحمٰن صاحب نے مولانا فضل الرحمٰن اور عمران خان سے بھی بات کی تھی اور کسی نے اس سلسلہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

## تنظیم میں شمولیت کا طریقہ کار

مفتی طارق مسعود نے پوچھا: اگر کوئی نوجوان تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کرنا چاہے یا درس دینا چاہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ ویب سائٹ tanzeem.org پر پورے پاکستان کے دفاتر کے پتے اور فون نمبر موجود ہیں۔ info@tanzeem.org پر ای میل بھی کی جا سکتی ہے۔ شامل ہونے سے پہلے دو تین بنیادی کتابچے پڑھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے‘ جن میں تنظیم اسلامی کا تعارف اور اس کی دعوت کا بیان ہے۔

شمولیت بیعت کے ذریعے ہوتی ہے۔ خواتین کی بیعت سورۃ الممتحنہ کے الفاظ پر ہوتی ہے کہ وہ شرک‘ چوری اور گناہوں سے بچیں گی‘ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں گی۔ مَردوں کے لیے مبتدی کی بیعت میں کلمہ‘ استغفار اور وعدہ ہوتا ہے کہ وہ نافرمانی چھوڑ دیں گے اور اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لیے محنت کریں گے۔ جو آگے بڑھ کر ملتزم بنتا ہے اس کی بیعت ’’بیعت عقبہ ثانی‘‘ کے الفاظ پر ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بیعت جناب رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر تھی‘ لہٰذا ہمارے ہاں بیعت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ امیر کی کوئی ایسی بات جو شریعت کے خلاف ہو تو اسے نہیں مانا جائے گا۔

(باقی صفحہ 98 پر)

# دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری!

شجاع الدین شیخ‘ امیر تنظیم اسلامی

(خطابِ جمعہ: ۳ اپریل ۲۰۲۶ء‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور)

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

قرآن حکیم میں سے سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۳۲ سے ۱۳۶ تک تلاوت کی گئی ہیں۔ پہلے اس مقام کا ترجمہ کر لیتے ہیں‘ ان شاء اللہ اس کی تھوڑی سی وضاحت بیان کرنا مقصود ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾﴾

’’اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾

’’اور لپکو اور تیزی دکھاؤ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اُس جنت کے حاصل کرنے کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کی مانند ہے‘‘

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾﴾

’’جو تیار کی گئی ہے متقین کے لیے۔‘‘

﴿الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾

’’یہ وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں خوش حالی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی‘‘

﴿وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾

’’اور وہ اپنے غصے کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔‘‘

﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾

’’اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔‘‘

﴿وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ ﴾

’’اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں یا اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھیں‘‘

﴿ذَکَرُوا اللّٰہَ﴾

’’تو اللہ کو یاد کر لیتے ہیں‘‘

﴿فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِہِمۡ ۪﴾

’’پس وہ اُس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں‘‘

﴿وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰہُ ۪۟﴾

’’اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشنے والا ہو!‘‘

﴿وَلَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾﴾

’’اور وہ اس پر اَڑے نہیں رہتے جو وہ کر بیٹھے جبکہ وہ جان لیتے ہیں۔‘‘

﴿اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ﴾

’’یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کا بدلہ ہے ان کے رب کی طرف سے بخشش کی صورت میں‘‘

﴿وَجَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ﴾

’’اور باغات کی صورت میں جن کے دامن میں نہریں جاری ہیں‘‘

﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ﴾

’’وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

﴿وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾﴾

’’اور عمل کرنے والوں کے لیے کیا ہی خوب اجر ہے!‘‘

اللّٰھم ربَّنا اجعلنا منھم! اے اللہ ہمیں بھی انہی لوگوں میں شامل فرما!

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور اہلِ جنت کی صفات کو جابجا بیان کیا ہے۔ کبھی قرآن عموم کے اعتبار سے ذکر کرتا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے‘ جنہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے جنت ہے۔ اس کے باغات ہیں‘ وہاں کی نعمتیں ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی مقام ہے کہ جہاں ترغیب کا پہلو بھی ہے‘ تشویق کا پہلو بھی ہے اور اہلِ ایمان سے جو تقاضے ہیں ان میں سے کچھ کا تذکرہ بھی فرمایا گیا ہے۔

صرف اشارتاً عرض کر رہا ہوں کہ پچھلی آیات میں سود کی ممانعت کا ذکر ہے۔ یہ بڑھتا چڑھتا سود ہے جس کو مرکب سود (کمپاؤنڈ انٹرسٹ) کہا جاتا ہے۔ سود مفرد یا سمپل انٹرسٹ کی مناہی سورۃ البقرۃ میں آئی ہے۔ بہرحال' یہاں سود کی ممانعت کے بعد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا تذکرہ آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور جنت کے حصول کی طرف مسابقت اور آگے بڑھ کر محنت کرنے کا ذکر ہوا۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کہا گیا۔ دوسروں کو معاف کرنے کی بات ہوئی۔ یہ صفات ان لوگوں میں ہوتی ہیں جن میں مال کی محبت نہ ہو' دنیا کی حرص نہ ہو' طمع نہ ہو۔ سود خوری سے انسان کے اندر مال کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اسی کے نتیجے میں پھر وہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے جہاں حُبِّ مال کے ساتھ حُبِّ جاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر تکبر' ظلم' دل کی سختی' حقوق العباد میں کوتاہی' یہ ساری برائیاں سود خوری ہی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ وہ ہے جو ان آیات میں ہمارے سامنے آرہا ہے جن کا اس وقت ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾﴾

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (ﷺ) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہ موضوع قرآن حکیم میں مستقل آتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے محض دعائیں کافی نہیں' بلکہ دُعا کے ساتھ دوا کی ضرورت بھی ہے۔ اس دوا کا ایک بڑا عنوان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ ''اَطِيْعُوْا'' کا مادہ ''طوع'' ہے جس میں دِلی آمادگی کا عنصر شامل ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ فرمایا گیا: ﴿طَوْعًا وَّكَرْهًا﴾ (الرعد:۱۵) ''آمادگی کے ساتھ بھی اور مجبوراً بھی''۔ ایک کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کسی بات کو کراہت کے ساتھ مانا جائے۔ بات پسند نہیں آرہی لیکن ماننا پڑ رہی ہے۔ جیسے اکثر افسرانِ بالا کی کڑوی باتیں تسلیم کرنا پڑتی ہیں' سخت فیصلوں کو ماننا پڑتا ہے۔ کیا کیا جائے کہ نوکری کا مسئلہ ہے۔ پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ ایسے میں آدمی کڑوی کسیلی باتیں بھی برداشت کرتا ہے۔ دل سے آمادہ ہو کر کام نہیں کرتا۔ البتہ جو اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مطلوب ہے وہ کراہت کے ساتھ نہیں ہے۔ معاذ اللہ! وہ ناپسندیدگی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ پوری دلی آمادگی کے ساتھ ہے۔ قرآن مجید ایمان والوں کی صفت کا ذکر یوں کرتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان لائے ان کی شدید ترین محبت تو اللہ کے لیے ہوتی ہے۔''

اور اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (الاحزاب:۶)

''نبی (ﷺ) ایمان والوں کے نزدیک ان کی جانوں سے بڑھ کر مقدم اور عزیز ہیں۔''

چنانچہ اس محبت کے جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت مطلوب ہے‘ مجبوراً نہیں۔ آگے فرمایا:

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ﴾

''اور دوڑو اپنے ربّ کی بخشش یعنی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف''

سَارِعُوْا مسارعت سے ہے‘ یعنی تیزی دکھانا۔ بہت سارے معاملات میں ہم تیزی دکھاتے ہیں مگر جہاں سب سے بڑھ کر محنت کرنی چاہیے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا معاملہ ہے۔ قربانی کے موقع پر جو دعائیں ہم مانگتے ہیں‘ ان میں یہ الفاظ بھی ادا کرتے ہیں:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ١٦٢ۙ﴾ (الانعام)

''بے شک میری نماز‘ میری قربانی‘ میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہان والوں کا رب ہے۔''

ساری محنتوں کا محور و مرکز اللہ کی ذات ہو جائے‘ وہ راضی ہو جائے۔ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ! اللہ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہ ہو۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی مطلوب نہ ہو۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی مقصود نہ ہو۔ یہ ہے سَارِعُوْا کا مفہوم۔ ایک لفظ سورۃ الحدید میں آتا ہے‘ جو ہمارے منتخب نصاب میں بھی شامل ہے:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (آیت ۲۱)

''اپنے رب کی مغفرت کے لیے مسابقت کرو۔''

مسابقت کو انگریزی میں ہم competition کہتے ہیں۔ دنیا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا ماحول ہے۔ سکولوں‘ کالجز‘ یونیورسٹیز‘ کارپوریٹ سیکٹر‘ خاندانوں‘ دوستوں میں آگے بڑھنے کی دوڑ ہے۔ انسان کے اندر یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ یہ پیش قدمی کس میدان میں ہو رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلۡهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝۲﴾ (التکاثر)

’’تمہیں غافل کیے رکھا ہے بہتات کی طلب نے! یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ جاتے ہو۔‘‘

مال اور دنیا کی محبت میں لگے رہے‘ خوب کثرت سے جمع بھی کر لیا لیکن پھر کیا ہوا: حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝۲ یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں۔ اب دو ٹکے بھی جیب میں جانے والے نہیں ہیں‘ نہ کفن میں جیب ہوتی ہے نہ وہاں سے آن لائن ٹرانزیکشن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سوچنا چاہیے کہ ہماری محنتوں کا رخ کدھر ہے۔ دنیا ایک ضرورت ہے‘ کوئی مقصد نہیں ہے۔ لہٰذا اسے ضرورت کی حد تک دیکھنا ہے‘ مقصود و مطلوب نہیں بنانا۔ بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوب ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے‘ تماشا نہیں ہے!

دنیا میں یہ ساری بھاگ دوڑ آخر کس چیز کے لیے‘ یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چاہے جتنا کچھ بھی بنا لیں‘ دو فٹ نیچے گئے تو سارا باہر پڑا رہ جائے گا۔ دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوڑنا انسان کی فطرت میں ہے۔ مسابقت کا جذبہ ہماری سرشت میں موجود ہے۔ ہمارا دین چونکہ دینِ فطرت ہے‘ لہٰذا وہ ان فطری جذبات کو کچلتا نہیں ہے‘ بلکہ انہیں صحیح رخ پر ڈھالتا ہے‘ چینلائز کرتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ جذبہ موجود ہے تو اللہ کی مغفرت کے حصول کے لیے کوشش کرو۔

﴿وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ﴾

’’اور اُس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین جتنا ہے۔‘‘

تمہاری تیزی‘ محنتیں‘ efforts ‘struggle‘ کمپیٹیشن جنت کے حصول کے لیے ہو۔

انسان جنت کی وسعتوں کا تصور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان حقائق کو ہمارے مشاہدات میں سے کچھ چیزوں کو سامنے رکھ کر سمجھاتا ہے۔ جس جنت کی چوڑائی (width) آسمان وزمین جیسی ہو تو اس کی لمبائی (length) کا عالَم کیا ہو گا‘ ہم تصور ہی نہیں کر سکتے۔ آسمان کے بارے میں قرآن یہ بھی فرماتا ہے:

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡىدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ۝۴۷﴾ (الذٰریٰت)

’’آسمان کو ہم نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور ہم وسعت دیے چلے جا رہے ہیں۔‘‘

آج دنیا اپنی تحقیق سے جہاں تک پہنچی ہے‘ expanding universe کا نظریہ

ہمارے سامنے ہے۔ یہ کائنات بھی وسعت پذیر ہے تو جنت کی وسعتوں کا پوری طرح سمجھنا تو ممکن نہیں۔ البتہ اس کا کچھ ادراک ہوسکتا ہے کہ اس کی چوڑائی آسمان وزمین جیسی ہے تو لمبائی کا عالم کیا ہوگا‘ تم تصور نہیں کرسکتے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ آخری بندہ جو سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں ڈالا جائے گا اس کی جنت اس دنیا سے دس گنا بڑی ہوگی۔ (صحیح مسلم) حدیث میں الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسکرائے کہ اس بندے کو یقین نہیں آرہا ہوگا کہ اتنی بڑی جنت اللہ تعالیٰ مجھے عطا فرمارہا ہے۔ آخری بندے کا عالم یہ ہے تو پہلے والوں کی جنت کیسی ہوگی! مقربین کی جنت کیسی ہوگی‘ انبیاء ورسل علیہم السلام کی کیسی ہوگی اور امام الانبیاء ﷺ کی کیا ہوگی‘ ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ یقین بھی عطا کرے‘ شوق بھی عطا کرے اور ہم سب کو جنت الفردوس عطا فرمائے!

یہ دعا ہے‘ لیکن دعا سے آگے دوا بھی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں دوا بھی بتاتا ہے‘ دعائیں بھی بتاتا ہے۔ آگے فرمایا کہ یہ سب کچھ کس کے لیے ہے:

﴿اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾﴾

یہ متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کچھ دن پہلے رمضان کا مہینہ گزرا۔ روزے کا حاصل تقویٰ ہے۔ ساری زندگی کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام کو چھوڑ دیا جائے‘ گناہوں سے دور رہا جائے‘ نافرمانی سے بچا جائے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اطاعت کے تقاضے بہرحال چند عبادات تک محدود نہیں ہیں‘ یہ پورا پیکج ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

’’اے اہلِ ایمان! اسلام میں داخل ہوجاؤ پورے کے پورے۔‘‘

ایسا تقویٰ پوری زندگی پر محیط ہوگا‘ جیسا کہ سورۂ آلِ عمران ہی میں آتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾

’’اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسے کہ اس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے‘‘

اس کی مزید وضاحت یوں کی گئی:

﴿وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

’’اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالتِ اسلام میں۔‘‘

مرتے دم تک مسلم رہنا۔ موت بھی اسلام کی حالت پر آئے۔ یہ ہے مرتے دم تک کا روزہ۔ یہ ہے ساری زندگی کا روزہ۔ یہ ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پاس داری۔ اللہ کی جنت کسی بھی طرح سستی نہیں ہے۔ دنیا میں تو بنیادی چیزیں بھی مفت میں نہیں ملتیں‘ تو کیا اللہ کی جنت ہمیں گھر بیٹھے مل جائے گی؟ صرف مانگنے سے مل جائے گی؟ صرف چاہنے یا طلب کرنے سے تو بچے کو اسکول میں کامیابی نہیں ملتی‘ ہمیں تنخواہ نہیں ملتی۔ جنت کے حصول کے کچھ تقاضے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جا بجا وہ تقاضے اور مطالبات ہمارے سامنے رکھتا ہے کہ یہ کرو تو تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ فرمایا گیا وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اب یہ متقین کون ہیں؟ قرآن کریم کے شروع میں سورۃ البقرہ ہی میں فرمایا:

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝٣﴾

’’جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر‘ اور نماز قائم کرتے ہیں‘ اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔‘‘

یہاں بھی کچھ صفات آرہی ہیں کہ جنت کن کے لیے ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾

’’جو انفاق کرتے ہیں خوشی میں بھی اور تکلیف میں بھی‘‘

خوش حالی ہو تب بھی‘ تنگ دستی ہو تب بھی۔ صحت کا عالم ہو تب بھی‘ بیماری کا عالم ہو تب بھی۔ معاشی اعتبار سے حالات مناسب ہوں تب بھی‘ حالات ذرا تنگ ہو جائیں تب بھی‘ یعنی ہر حال میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ یُنْفِقُوْنَ کے ساتھ یہاں مال کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے دروس میں بھی بار بار آتی ہے اور مفتی محمد شفیع ؒ نے بھی اپنی تفسیر ’’معارف القرآن‘‘ میں ذکر کیا کہ یہاں یہ معین نہیں کیا گیا کہ کس چیز کا انفاق مطلوب ہے۔ اللہ نے جان دی ہے‘ اولاد دی ہے‘ صلاحیتیں دی ہیں‘ وسائل دیے ہیں۔ سوچنے‘ بولنے‘ سننے‘ لکھنے کی صلاحیت ہے۔ مینجمنٹ کی صلاحیت ہوگی‘ آئی ٹی صلاحیتیں ہوں گی‘ مالیات (finance) سے متعلق صلاحیتیں ہوں گی۔ جو کچھ بھی ہے‘ اس سب کا انفاق مطلوب ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحدید میں فرمایا:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط﴾ (آیت ۷)

’’جس شے میں اللہ نے تمہیں اختیار عطا فرمایا اس میں سے خرچ کرو۔‘‘

اختیار جان پر بھی ہے‘ مال پر بھی ہے‘ اولاد پر بھی ہے‘ صلاحیتوں پر بھی ہے‘ وسائل پر بھی ہے‘ ان سب کو لگاؤ۔ اس لگانے میں مخلوقِ خدا پر لگانا بھی شامل ہے‘ البتہ اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ کے کلمے کی دعوت کے لیے‘ اللہ کے دین کی دعوت کے لیے‘ اللہ کے دین کی سربلندی کی جدّ وجہد کے لیے‘ اللہ کے دین کے نفاذ اور قیام کے لیے جِدّ وجہد کی جائے۔ لہٰذا جو کچھ بھی وسائل ہیں‘ اس سب کا انفاق مطلوب ہے۔

یہ انفاق خوش حالی میں بھی ہونا چاہیے اور تنگ دستی میں بھی۔ جب تنخواہ ملتی ہے تو بندہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ کبھی تنخواہ کے ساتھ بونس بھی تو ملتا ہے تو اس میں سے بھی اللہ کی راہ میں خرچ ہوتا ہے۔ بعض کاروبار seasonal ہوتے ہیں کہ آٹھ مہینے ذرا ہلکا چلتا ہے جبکہ چار مہینے خوب چلتا ہے۔ جب چار مہینے خوب چلتا ہے تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا معاملہ بھی بڑھتا ہے۔

اس کا ایک دوسرا پہلو (aspect) یہ ہے کہ اگر اللہ نے وسائل کم دیے ہیں تب بھی خرچ کیا جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اللہ کی راہ میں کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر بھی تم اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہو۔ یہ صحیح مسلم شریف کی روایت ہے۔ چنانچہ انفاق کے معاملے کو ہر بندہ اپنی استعداد (capacity) کے مطابق دیکھے۔ خرچ کرنے کے اعتبار سے اس رخ پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جب دنیا میں ہمارے ایونٹس آ جاتے ہیں تو کتنا خرچ ہوتا ہے! ایونٹس صرف شادی بیاہ کے نہیں ہوتے۔ ایونٹ یہ بھی ہوتا ہے کہ سمارٹ فون کا نیا ورژن آ گیا ہے‘ گاڑی کا فلاں نیا ماڈل آ گیا ہے‘ برینڈز میں ایک اور برینڈ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ لوگ ٹینشن میں ہوتے ہیں۔ اگر ایک سال ہو گیا اور سمارٹ فون کا سیٹ تبدیل نہیں ہوا تو سمجھتے ہیں ہمارا تو گزارا ہی نہیں ہو رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! بعض خواتین حد سے زیادہ حساس (over-sensitive) ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے گھرانوں میں بڑی بڑی Prado اور Pajero کے اندر پانی کے بڑے بڑے ڈرم رکھ کر اُسی وقت خریدے گئے کپڑوں کو پانی میں ڈال کر shrink کرتی ہیں‘ صرف اس لیے کہ سب سے پہلے کسی درزی کے ہاں میں نے پہنچانا ہے اور سب سے پہلے میں نے پہن کر دکھانا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو باقاعدہ آہ وزاری شروع کر دیتی ہیں۔ بڑے گھرانوں کے بڑے مسائل ایسے ہوتے ہیں۔ یہ براہِ راست معلومات

ہیں۔ جن گھرانوں میں ہوا‘ انہی لوگوں نے یہ باتیں بتائیں۔ آج ہمارے یہ لچھن ہیں۔ ہر ویک اینڈ ہمارا ایونٹ بنا ہوا ہے۔ البتہ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بات آتی ہے تو مہنگائی کا رونا رویا جاتا ہے۔ اس وقت پیٹرول بھی یاد آتا ہے‘ بجلی کا مہنگا ہونا بھی یاد آتا ہے‘ افراطِ زر بھی یاد آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرما دے! اگر جنت چاہیے تو اللہ کی طرف رخ ذرا زیادہ کرنا پڑے گا۔ اللہ کے دین کے لیے بھی خرچ کرنا ہے۔ اللہ کی مخلوق پر بھی خرچ کرنا ہے۔

آگے فرمایا:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾

’’اور وہ اپنے غصے کو پی جانے والے ہیں۔‘‘

اس میں بہت تفصیل ہے۔ یہ ایمان والوں کی صفت بیان ہو رہی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی کیفیات بھی ہمارے سامنے رہنی چاہئیں۔ ذاتی معاملات میں رسول اللہ ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔ آپ ﷺ معاف فرماتے تھے۔ ذاتی معاملات میں انتقام رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی نہیں لیا۔ آج ہمارے گھر میں نمک مرچ اوپر نیچے ہو جائے تو غصہ آ جاتا ہے۔ کسی سے گلاس گر جائے تو بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر آج ہمیں غصہ آ جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صِدِّیقہ ؓ نے فرمایا کہ اپنے ذاتی معاملات میں حضور ﷺ کو کبھی غصہ نہ آتا‘ البتہ اگر کوئی حدود اللہ سے تجاوز کرتا تو سب سے زیادہ غصہ آپ ﷺ کو آتا تھا۔ چہرہ مبارک سرخ ہو جاتا تھا۔ آج ہمارے ہاں یہ غیرت کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ گھر میں نمازیں ضائع ہوں‘ کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ گھر میں سکرین پر کیا چل رہا ہے‘ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ڈریس کوڈ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں‘ کوئی پریشانی نہیں۔ گھر میں حرام تو نہیں آ رہا‘ کوئی فکر نہیں۔ آج ہمارا غصہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔ انہی چکروں میں لوگوں کے بلڈ پریشر بڑھے ہوئے ہیں‘ برین ہیمرج کے معاملات ہیں‘ امراضِ قلب کے مسائل ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو غصہ اُس وقت آتا تھا جب اللہ کا حکم ٹوٹتا۔ ہمیں نہ معاشرے میں اللہ کے احکام ٹوٹنے پر غصہ آ رہا ہے‘ نہ اللہ کے دین کے مٹائے جانے اور اس کی مغلوبیت پر کوئی غصہ آ رہا ہے‘ نہ سود کے معاملے پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی حالت جاری رکھنے میں کوئی غصہ آتا ہے۔ جن مسائل پر آنا چاہیے وہاں آ نہیں رہا جبکہ جہاں نہیں آنا چاہیے وہاں ضرورت

سے زیادہ غصہ لا کر اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں۔ چنانچہ عام حالات میں غصے کو پی جانا پسندیدہ ہے۔ جہاں دین کا حکم ٹوٹ رہا ہے' وہاں غصے کا اظہار مطلوب ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ غصہ آنا انسان کی فطرت میں ہے۔ اس کا اظہار صحیح جگہ پر ہو گا تو اپنا بھی فائدہ ہے' معاشرے کا بھی' جبکہ غلط جگہ نکلے گا تو اپنا بھی نقصان کریں گے' اپنے گھر کا بھی' اور معاشرے کا بھی۔ یہاں پسندیدہ بات یہ آ رہی ہے کہ وہ غصے کو پی جاتے ہیں۔ مزید فرمایا:

﴿وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾

''اور لوگوں (کی خطاؤں) سے درگزر کرنے والے ہیں۔''

صرف غصہ پی نہیں جاتے بلکہ معاف بھی کرتے ہیں۔ عفو یہ ہے کہ دل سے معاف کر دیا جائے۔ یہ نہیں کہ ظاہر میں تو مسکراہٹ دکھائی جائے لیکن اندر منفی جذبات پل رہے ہوں۔ ایسے میں پھر بلڈ پریشر بڑھے گا' ٹینشن بڑھے گی' اپنے لیے پریشانیاں پیدا کریں گے۔ دل سے معاف کرنے کا ایک بڑا خوب صورت لیکن قدرے مشکل نسخہ یہ ہے کہ جس کے بارے میں کوئی مسئلہ ہو' اس کے لیے تنہائی میں دعا کرنا شروع کر دیں۔ ان شاء اللہ دل صاف ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے!

اس کے بعد اسلوب بدلتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾﴾

''اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

ایک ہے صرف معاف کر دینا' دل صاف کر لینا جبکہ ایک ہے اس سے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ بھلا سلوک کرنا۔ یہ اور بھی مشکل بات ہے۔ داعیانِ دین کو سورۂ حٰم السجدۃ میں راہنمائی فراہم کی گئی ہے' جو مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں بھی شامل ہے:

﴿وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ﴾

''اور (دیکھو!) بھلائی اور بُرائی برابر نہیں''

﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ﴾

''تم مدافعت کرو بہترین طریقے سے''

یعنی بُرائی کا جواب تم بھلائی سے دو۔

﴿فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾﴾

’’تو (تم دیکھو گے کہ) تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہوگی وہ گویا تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔‘‘

ایسا اس وقت ہوگا جب بدی کے مقابلے میں جواب بھلائی سے دیا جائے گا۔ یہ آسان نہیں، لیکن جنت بہرحال مشقتوں سے، مشکلات سے گھیری گئی ہے۔ یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما رہا ہے۔ ’’حدیثِ جبریلؑ‘‘ میں رسول اللہ ﷺ نے ’’احسان‘‘ کی تعریف بایں الفاظ فرمائی:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ، فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ))

’’اللہ کی بندگی ایسے کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے دیکھ نہیں سکتے تو (یقین رکھو کہ) اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔‘‘

اس کے ذیل میں ایک قابل قدر واقعہ بھی ہے، جسے مفتی محمد شفیعؒ نے بھی نقل کیا اور دیگر مفسرین نے بھی۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے جناب علیؒ کی خادمہ وضو کا پانی پیش کر رہی تھی کہ برتن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی ان کے کپڑوں پر گر گیا۔ اب ظاہری بات ہے کہ چہرے پر کچھ ناگوار تاثرات آنے لگے۔ ایسے میں اس خادمہ نے آیت کا یہ حصہ پڑھا: ﴿وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ﴾ یہ سن کر جناب علی بن حسینؒ کے چہرے سے منفی اثرات چلے گئے۔ پھر خادمہ نے کہا: ﴿وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾ اس پر جناب علیؒ نے کہا کہ میں نے تجھے معاف کر دیا۔ خادمہ نے مزید کہا: ﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾ اس پر آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ غصے کو پی گئے، خطا کو معاف کر دیا اور احسان کیا کہ اسے آزاد کر دیا۔ اُس زمانے کی کنیزوں کو بھی قرآن آتا تھا، آج ہم اپنا جائزہ لیں کہ ہمیں کتنا قرآن آتا ہے۔ ہم اپنے معاملات پر قرآن کا کس قدر حوالہ دیتے ہیں۔ جب اللہ کا کلام quote ہوگا تو پھر اللہ کی بات بھی آئے گی، اللہ کا خوف بھی دل میں ہوگا، اللہ کی محبت بھی دل میں ہوگی۔ قرآن کا نور بھی ہوگا۔ اس سے نہ صرف ہمارا بلکہ پوری دنیا کا فائدہ ہوگا۔ یہ غور طلب بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے!

اس سے آگے یہ ذکر ہے کہ اگر خطا کر بیٹھتے ہیں تو اس پر اڑے نہیں رہتے بلکہ اللہ کے

سامنے جھک جاتے ہیں‘اس سے استغفار کرتے ہیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشنے والا ہو؟ انفرادی سطح پر جب تک کہ موت کا غرغرہ نہ آ جائے‘ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اہلِ ایمان گناہ کرتے نہیں ہیں‘ان سے ہو جاتا ہے۔ اگر ہو جاتا ہے تو اس پر اڑے نہیں رہتے‘ اللہ کی طرف پلٹ آتے ہیں‘ اللہ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ حقوق العباد میں کوتاہی کر بیٹھیں یا حقوق اللہ میں‘ اللہ کے حضور جھک جاتے ہیں۔ توبہ اور استغفار کا یہ پہلو انفرادی سطح کا بھی ہے اور اجتماعی سطح کا بھی۔ آج جو ہم پر مصائب ہیں‘ وہ ہمارے اجتماعی گناہوں کی وجہ سے ہیں۔ یہاں قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخش دینے والا ہو؟ اور ایمان والوں کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے کیے پر جانتے بوجھتے اڑے نہیں رہتے۔ جب وہ غلطی کر بیٹھتے ہیں تو فوراً پلٹ آتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعے میں حضرت آدم علیہ السلام جھک گئے تھے جبکہ شیطان اَڑ گیا تھا۔ لہٰذا کامیابی حضرت آدم علیہ السلام کو ملی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کے کلمات بھی سکھا دیے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ۜ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (الاعراف)

’’(اس پر) وہ دونوں پکار اُٹھے کہ اے ہمارے ربّ! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر‘اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم تباہ ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے معافی کا اعلان بھی فرما دیا‘ جبکہ ابلیس راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔ چنانچہ ایمان والوں سے اگر گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ سچی توبہ کرتے ہیں۔ پھر ان کے لیے اللہ کی مغفرت اور اللہ کی طرف سے جنت کے وعدے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہی اہلِ جنت میں ہم سب کو شامل فرمائے!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘ آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

# اسلام‘ جمہوریت اور پاکستان

ایوب بیگ مرزا

ایک زمانہ تھا جب پاکستان کی اشرافیہ سیاسی اور اسلامی جماعتوں سے ’’پاکستان اسلام کا قلعہ ہے‘‘ اور ’’جمہوریت پاکستان کی اساس، جڑ اور بنیاد ہے‘‘ جیسے نعرے لگواتی تھی۔ اہلِ پاکستان کو توقع تھی کہ جلد ہی یہ نعرے حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ ۱۹۴۹ء میں جب قراردادِ مقاصد منظور ہوئی تو محسوس ہوا کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ اب دنوں کی نہیں تو مہینوں کی بات یقیناً ہوگی۔ خوشی اور قلبی سکون کی ایک لہر تھی جس نے عوام کے دلوں کو گرما دیا۔ افسوس‘ صد افسوس‘ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد پاکستان میں اسلام کے لیے دروازے بند ہی نہیں بلکہ مقفل کر دیے گئے اور جمہوریت کے ساتھ وہ کھلواڑ کیا گیا کہ وہ ایک گالی بن گئی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام پاکستان کا باپ ہے اور جمہوریت پاکستان کی ماں ہے‘ لیکن اشرافیہ نے اس باپ کو گھر کی دہلیز پر ہی روکے رکھا اور اسے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی جبکہ ماں کی توہین بلکہ ایسی بے حرمتی کی کہ اچھے بھلے لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ اللہ ایسی نافرمان اولاد سے سب کو محفوظ رکھے۔ اگرچہ عام شہری بھی اتنے معصوم نہیں ہیں کہ ذاتی مفادات پر زد پڑے اور وہ بلک نہ اٹھیں‘ لیکن اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے انہوں نے نعروں پر ہی اکتفا کرنا مناسب سمجھا۔ اشرافیہ نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور سرِ تسلیم خم کے خوگر ہو جانے والے عوام کے ذاتی اور مالی مفادات پر بھی اب بھاری پاؤں رکھ دیا۔ عوام اب برداشت کے چونکہ کافی عادی ہو چکے ہیں‘ لہٰذا اشرافیہ کے ہاتھوں اس حوالے سے بھی پس جانے پر میدان میں نکلنے کی جرأت نہیں کرتے۔ وہ سوشل میڈیا کو ڈھال بناتے ہیں‘ اسی پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اشرافیہ سوشل میڈیا کی ناکابندی کرنے کے لیے انہی عوام کے اربوں روپے خرچ کر رہی ہے‘ لیکن فی الحال ناکام ہے۔ اشرافیہ کی یہ ناکامی ایک

دوسرے زاویے سے اسے کامیابی کی راہ بھی دکھاتی ہے۔ سوشل میڈیا کے ’’مجاہد‘‘ سمجھتے ہیں کہ یہی کافی ہے‘ کیونکہ آنسو گیس، لاٹھی اور گولی کا سامنا کرنے کے لیے نہ ان میں حوصلہ رہا ہے نہ وہ اب اس کو قابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے چھپ چھپا کر کھیلنا اور دل کی بھڑاس نکالنے کا وطیرہ بنالیا ہے۔ وہ رائے عامہ اپنے حق میں کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہیں جس پر اشرافیہ ناک بھوں چڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔

اس تحریر میں راقم پاکستان میں جمہوریت کی کہانی مختصر ترین انداز میں پیش کرے گا۔ اس دوران اسلام کو کہاں کہاں اور کیسے استعمال کیا گیا‘ اس پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ جمہوریت پر پہلا حملہ اس وقت ہوا جب کانگریس کی مدد سے صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی حکومت کو ختم کر دیا گیا۔ اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں عوام نے مسلم لیگ کے حق میں اور کانگریس کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ بہرحال مرکزی حکومت کے پہلے چار سال یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک خیریت سے گزرے۔ اس دوران لیاقت علی خان وزیراعظم رہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو انہیں لیاقت باغ‘ راولپنڈی میں عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اکبر نامی شخص نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ قریب موجود پولیس والوں نے قاتل کو فوری طور پر گولیوں سے بھون ڈالا۔ ظاہر کیا گیا کہ ایسا جذباتی سطح پر ہوا‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سازش میں سرکاری اہلکاروں کی شرکت کا یہ واضح اظہار تھا‘ تاکہ قاتل گرفتار ہو کر سازشی تانا بانا بُننے والوں کو بے نقاب نہ کر دے۔ سچ یہ ہے کہ اس قتلِ ناحق نے پاکستان میں جمہوریت کے پاؤں ہمیشہ کے لیے اکھاڑ دیے‘ جو پھر کبھی جم نہ سکے۔ لیاقت علی خان کی شہادت سے پہلے ایوب خانی مارشل لاء تک سات سالوں میں خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرا، آئی آئی چندریگر، چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی اور فیروز خان نون پاکستان کے وزیراعظم بنے۔ گویا ایک حکومت اوسطاً ایک سال ایک ماہ رہی۔ فیروز خان نون کی حکومت کے خلاف صوبہ سرحد کے خان عبدالقیوم خان نے اُس وقت تک کا سب سے بڑا جلوس نکالا اور چند دن بعد آرمی چیف ایوب خان نے ’’میرے عزیز ہم وطنو!‘‘ کی صدا لگا کر جمہوریت کا بوریا بستر لپیٹ دیا۔ یہاں اس نکتے کی وضاحت بڑی ضروری ہے کہ اگرچہ مرکزی حکومتوں کا یوں آنا جانا سیاسی عدم استحکام کا منہ بولتا ثبوت تھا لیکن آج

ملک کے تمام غیر جانبدار تجزیہ نگار اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس لنگڑی لولی جمہوریت پر اگر شب خون نہ مارا جاتا تو وہ آہستہ آہستہ اپنی کمزوریوں کو دور کر لیتی اور ملک میں سیاسی استحکام آ جاتا۔

اُس وقت کی عالمی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ جنگ عظیم دوم نے سپر پاورز سوویت یونین اور امریکہ کو آمنے سامنے کر دیا تھا۔ برطانیہ جو اس سے پہلے سپر پاور تھا' امریکہ کے حق میں دستبردار ہو چکا تھا۔ امریکہ اور سوویت یونین میں سیاسی اور عسکری کشمکش جاری تھی۔ دونوں اپنی اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے مختلف ممالک کو اپنا حلیف بنا رہے تھے۔ مغربی یورپ امریکہ کا حلیف بن گیا جبکہ مشرقی یورپ سوویت یونین کے ساتھ جُڑ گیا۔ برصغیر تقسیم ہو کر بھارت اور پاکستان کے نام سے دو ممالک وجود میں آ چکے تھے۔ بھارتی سیاست دانوں میں کمیونزم کے جراثیم موجود تھے' چنانچہ ان کا منطقی رجحان سوویت یونین کی طرف تھا جہاں ملحد نظام قائم ہو چکا تھا۔ وہ پاکستان جو مذہب کے نام پر قائم ہوا تھا' اس کا سوویت یونین سے کسی قسم کے رابطے اور تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ امریکہ آبادی کی اکثریت کے حوالے سے ایک عیسائی ریاست تھی' یعنی کم از کم خدا کے وجود کا اقرار تو تھا' لہٰذا منطقی طور پر پاکستان کا رجحان سوویت یونین کے حریف امریکہ کی طرف ہوا۔ یہاں حوالے کے طور پر نوٹ کر لیں کہ تقسیمِ ہند سے چند ماہ پہلے امریکی کانگریس کا ایک وفد قائداعظم سے ملا تھا' جس کو یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ پاکستان خطے میں امریکی مفادات کا تحفظ کرے گا۔ ظاہر ہے کہ قائداعظم نے اس تعاون کا اظہار سوویت یونین کے مذہب دشمن نظریات کے پس منظر میں کیا تھا۔ قائداعظم کی پالیسی واضح اور قابلِ فہم تھی۔ اِس میں کسی قسم کا ابہام نہیں تھا۔ بھارت نے دوغلی پالیسی اختیار کی۔ وہ سوویت یونین کا حلیف بھی بن گیا اور غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کا رکن بھی۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ کس طرح خفیہ طور پر امریکہ سے نہ صرف رابطے میں تھا بلکہ اس سے مستفید بھی ہوتا رہا۔

امریکہ کی یہ پالیسی سامنے آئی کہ بھارت کو ناراض کیے بغیر پاکستان سے مضبوط اور دوستانہ تعلقات قائم کر کے سوویت یونین سے عسکری طور پر نمٹا جائے' اور کمیونزم کا راستہ روکا جائے۔ پاکستان چونکہ جغرافیائی لحاظ سے سوویت یونین کے قریب واقع تھا اور نظریاتی طور پر اس کا بدترین دشمن تھا' لہٰذا ان دونوں کیفیات کی بنا پر اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ گویا

اُس وقت امریکہ کے لیے پریشان کُن مسئلہ یہ تھا کہ ہرصورت سوویت یونین کا راستہ روکا جائے۔ اس کے لیے امریکہ کو پاکستان میں ایک مضبوط حکومت کی ضرورت تھی جبکہ یہاں حال یہ تھا کہ ہر دوسرے دن حکومتیں تبدیل ہو رہی تھیں۔ پاکستان کے آرمی چیف ایوب خان نے فیروز خان نون کے دورِ حکومت میں امریکہ کا ظاہری طور پر عسکری مسائل کے حوالے سے دورہ کیا' لیکن واپسی کے کچھ عرصے بعد ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ظاہر ہے امریکہ نے ترغیب بھی دی اور اِس حوالے سے تعاون کا وعدہ بھی کیا۔ پاکستان کی جمہوریت کے لیے یہ پہلا لیکن زوردار دھچکا تھا۔ اگر باریک بینی سے پاکستان کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ ایک ایسا زلزلہ تھا جس کے آفٹر شاکس سے آج تک پاکستان کی جمہوریت متزلزل ہے اور اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہو پا رہیں۔ البتہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ اُس وقت عوام جو روز روز حکومتوں کے بدلنے سے تنگ آ چکے تھے' انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ عوام نہیں جانتے تھے کہ لُطف دینے والا یہ لمحہ دراصل مدہوشی کا ایسا ٹیکا ہے جس کے نتیجے میں بالآخر ان کا سب کچھ لُٹ جائے گا۔ اُس وقت کس کو خبر تھی کہ یہ حکومتی مضبوطی درحقیقت ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی بنیاد بننے والی ہے۔ ایوب خان نے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک حکومت کی جو بظاہر بڑی مضبوط تھی۔ اس دوران ملک میں صنعتی انقلاب آیا۔ ڈیم تعمیر ہوئے' جس سے زراعت نے دن دُگنی رات چوگنی ترقی کی۔ خوش حالی دیوار پر لکھی نظر آنے لگی۔ اس فولادی حکومت نے ۱۰ سال مکمل کیے تو ملک بھر میں جشن منایا گیا۔ یہ کہا سنا گیا کہ اس حکومت نے عوام کی تقدیر بدل دی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ نظر آنے والے حقائق کے مطابق ملک اقتصادی لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ بھارت اور پاکستان ایک ہی وقت میں آزاد ہوئے تھے لیکن پاکستان ہر لحاظ سے آگے بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ اقتصادی صورت حال اُس وقت یہ تھی کہ پاکستان کا ایک روپیہ بھارت کے قریباً پونے تین روپے کے برابر تھا۔ ایوب حکومت نے دس سالہ جشن زور شور سے منایا لیکن اُس حکومت کے زوال کا آغاز بھی وہیں سے شروع ہو گیا۔ ایوبی حکومت کے دوران ۱۹۶۵ء میں بھارت سے بھی ایک ٹاکرا ہوا۔ بھارت اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہوا' لیکن پاکستان کامیابی سے اپنا دفاع کر گیا۔ اس جنگ کے بعد پاکستان میں چھ ستمبر کو ''یوم دفاع'' منایا جاتا جس میں عوام جوش و

خروش سے شرکت کرتے۔ یہ عسکری دفاع ایوب خان کا سیاسی دفاع کرنے میں ناکام رہا۔ مشرقی پاکستان نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ جنگ میں اُس کے دفاع سے مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ اگر بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیتا تو اس کا دفاع ناممکن تھا۔ قصہ مختصر‘ عوامی تحریک کے ہاتھوں مجبور ہو کر مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنما شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کرنا پڑ گیا‘ جس نے رہا ہونے کے بعد بدنام زمانہ چھ نکات سامنے رکھے۔ مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو یہ چھ نکات پسند تو ہرگز نہ تھے لیکن ایوب خان کی دشمنی میں خاموشی اختیار کی اور تحریک جاری رکھی۔ ایوب خان نے عوامی غیظ وغضب کو بھانپ کر اپنے عہدے سے استعفاء تو دے دیا لیکن حماقت عظمیٰ یہ کی کہ اپنے ہی بنائے ہوئے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سپیکر کے بجائے اقتدار آرمی چیف یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔ کاش ایوب خان اس وقت اپنی جان بچانے کی بجائے پاکستان کا سوچتے اور عام انتخابات کا اعلان کر دیتے! نئے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یحییٰ خان نے عام انتخابات کا اعلان تو کر دیا لیکن یہ ساز باز ہوتی رہی کہ اگلی حکومت میں اسے صدر منتخب کیا جائے۔ یہ ہدف حاصل ہوتا نظر نہ آیا تو مغربی پاکستان کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ مل کر انتخابات ملتوی کر دیے گئے۔ بعد ازاں انتخابات کے نتائج تسلیم نہ کرنے پر مشرقی پاکستان میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ پاکستان سیاسی اور عسکری اقتدار کے حریصوں کے ہاتھوں دولخت ہو گیا۔

یہاں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس سانحے کا کلیدی ذمہ دار بھٹو تھے کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو غیر مشروط طور پر اقتدار منتقل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ انتخابات میں دوسرے نمبر پر آنے کے باوجود وہ اقتدار میں حصہ طلب کر رہے تھے۔ گویا پاکستان کی شکست وریخت کے ذمہ دار بھٹو اور یحییٰ دونوں تھے۔ جمہوری حل اور وقت کا تقاضا یہ تھا کہ زیادہ نشستیں جیتنے والی عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کیا جانا چاہیے تھا۔ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات اگرچہ مرکز کو کمزور کر دینے والے تھے لیکن وہ جب خود مرکز میں حکومت سنبھالتا تو مرکز کی مضبوطی اُس کی ضرورت بن جاتی۔ بہرحال‘ ذاتی اقتدار کی ہوس نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے چند سال حکومت کی۔ وہ ایک باصلاحیت شخص تھے۔ خارجہ پالیسی کے ایک اچھے ماہر تھے۔ چین سے قریبی اور زبردست تعلقات قائم کرنے میں ان کا کلیدی اور اہم ترین رول تھا۔ پھر یہ کہ شملہ معاہدہ ایک

کرشمہ تھا' جس سے وہ بھارت میں قید پاکستانیوں کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ بھارت میں کانگریس کی حریف جماعتیں خاص طور بی جے پی آج تک اِس پر سر پیٹتی ہیں۔ اُس کا موقف ہے کہ بھارت نے میدان میں جیتی جنگ میز پر ہار دی۔ بہرحال یہ بھٹو کی زبردست کامیابی تھی۔ داخلی سطح پر بھٹو نے فاش غلطیاں کیں۔ معاشی لحاظ سے نیشنلائزیشن کی پالیسی جبکہ سیاسی لحاظ سے اپنے دشمن کو برداشت نہ کرنا اور فکس اپ کر دینے جیسی احمقانہ کارروائیوں نے ملک کو برباد کر دیا۔ بھٹو نے ایک خاص حکمت عملی کے تحت وقت سے پہلے انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان سیاسی حریفوں میں نہ صرف کشیدگی بلکہ انتشار ہے' لہٰذا فائدہ اٹھایا جائے۔ ان کی امیدوں کے قطعی طور پر برعکس' اپوزیشن ''پی این اے'' کے نام سے یوں متحد ہوئی کہ ایسا لگا جیسے وہ کبھی منتشر تھی ہی نہیں۔ انتخابات ہوئے جس میں بھٹو اور ان کے ساتھیوں نے ایک حماقت کی۔ وہ الیکشن جیت رہے تھے لیکن اس خواہش کے تحت کہ بڑے مارجن سے جیتیں' انہوں نے چند نشستوں پر دھاندلی کی۔ پی این اے کو موقع مل گیا اور انہوں نے تحریک چلائی۔ یہ تحریک چند دنوں میں ناکام ہوتی نظر آنے لگی تو کسی سیانے نے انہیں مشورہ دیا کہ اس تحریک کو مذہب کا ٹچ دے دو۔ مشورے پر عمل ہوا تو اپوزیشن کے لیے انتہائی زبردست نتائج سامنے آئے۔ لوگوں نے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نام سے چلنے والی تحریک میں سینہ کھول کر گولیاں کھائیں' تاکہ وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہو سکیں۔ بہرحال اِس تحریک کا نتیجہ ایک اور مارشل لاء کی صورت میں نکلا۔

نئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق تھے جنہیں بھٹو نے بڑی چھان بین کے بعد منتخب کیا تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ بھٹو خود لکھتے ہیں کہ میں نے آرمی چیف مقرر کرنے کے حوالے سے مختلف حکمرانوں کے تجربوں کا جائزہ لیا۔ یہاں تک کہ یورپ میں کیسے آرمی چیف مقرر کیے گئے؟ انہوں نے کس طرح اپنی ذمہ داریاں نبھائیں؟ اپنے دور کا پہلا آرمی چیف انہوں نے جنرل گل حسن کو منتخب کیا' لیکن جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ غلام مصطفیٰ کھر جو بھٹو کے قریبی ترین ساتھی تھے ان کی ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ جنرل گل حسن سے نجات دلائیں۔ مصطفیٰ کھر نے جنرل صاحب کو اہم قومی امور کے حوالے سے لاہور میں گفتگو کا جھانسہ

دیا اور گورنر ہاؤس کے ایک کمرے میں بند کر کے استعفے کا مطالبہ کیا۔ ڈرا دھمکا کر انہیں استعفاء دینے اور یورپ کے ایک ملک میں سفیر کا عہدہ سنبھالنے پر رضامند کرلیا۔ جب بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کو آرمی چیف مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ سینیارٹی لسٹ میں ساتویں نمبر پر تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا پس منظر یہ تھا کہ وہ بریگیڈیئر کی حیثیت سے ڈیپوٹیشن پر اردن گئے تھے۔ شاہ اردن کو مسئلہ یہ تھا کہ فلسطینی اُن کی جان کا عذاب بنے ہوئے تھے۔ بریگیڈیئر ضیاء الحق نے فلسطینیوں کو حکومت کی رضا پر راضی رہنے کے لیے اور حکومت کی اطاعت قبول کرنے کے لیے ایسا سبق سکھایا جسے فلسطینیوں کی اولاد آج تک نہیں بھولی۔ اس وفا شعاری کے بعد وہ پاکستان آگئے اور جلد ہی جنرل کے عہدے پر ترقی پا گئے۔

درحقیقت اُنہوں نے ثابت کیا کہ وہ حکومت کی عمل داری کے لیے آخری حد تک جا سکتے ہیں' چاہے حکومتی فرمان انتہائی ظالمانہ ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال جب بھٹو نے آرمی چیف کے انتخاب کے حوالے سے جنرل ضیاء الحق کا انٹرویو لیا تو ایک سوال یہ بھی کیا کہ: پاکستان کے حالات پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟ جنرل صاحب کا جواب تھا کہ مجھے اپنے ملک کے حالات کی قطعی طور پر کوئی خبر نہیں' میں تو اخبار بھی نہیں پڑھتا۔ بھٹو کو جنرل ضیاء الحق کی دو ادائیں بہت ہی پسند آئیں۔ ایک تو حکمران کے کہنے پر فلسطینیوں کو سبق سکھانا اور دوسرا سادگی کی یہ انتہا کہ ملکی حالات سے بھی بے خبر ہیں' یعنی سیاست سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا جنرل ضیاء الحق کا نام آرمی چیف کے لیے طے کرلیا گیا۔ شنید یہ ہے کہ جنرل گل حسن نے اس ملک سے جہاں وہ سفیر مقرر کیے گئے تھے' بھٹو کو پیغام بھجوایا کہ جنرل ضیاء الحق کو آرمی چیف بنانے کی غلطی ہرگز نہ کرنا' ورنہ پچھتاؤ گے۔ بھٹو نے ان کے مشورے کو کوئی اہمیت نہ دی اور ضیاء الحق کو آرمی چیف مقرر کردیا۔ بقایا تاریخ ہے۔

البتہ یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جب تک بھٹو کی کرسی مضبوط تھی' آرمی چیف ضیاء الحق انہیں آؤٹ آف وے پروٹوکول دیتے تھے اور اُن سے وفاداری کے اظہار کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ مولانا کوثر نیازی اپنی کتاب ''اور لائن کٹ گئی'' میں لکھتے ہیں کہ جب پی این اے کی تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ عروج پر پہنچ گئی اور بھٹو کی کرسی ہچکولے کھا رہی

تھی تو کابینہ کی ایک میٹنگ میں ضیاء الحق کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑے ہو گئے اور حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا زوردار انداز میں اعادہ کیا۔ البتہ بھٹو کو یہ اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ امریکی سفیر جنرل ضیاء الحق کے ساتھ مسلسل رابطے میں ہیں۔ اِن ہی اطلاعات کی بنیاد پر ذوالفقار علی بھٹو پی این اے کے تمام مطالبات مانتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ نئے انتخابات کرانے اور تمام معاملات پر صلح کا فارمولا طے ہو گیا۔ بھٹو اس قدر مطمئن تھے کہ خلیجی ممالک کے دورے پر چلے گئے۔ واپسی پر ایک رات وہ میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے‘ جس کے اختتام پر جنرل ضیاء الحق کمرے سے باہر آ گئے تو ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار واضح تھے۔ وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ پی این اے سے معاملات اگرچہ مکمل طور پر طے ہو چکے تھے‘ لیکن بھٹو حکمت عملی کے تحت معاہدے کا انکشاف نہیں کر رہے تھے۔ وہ وزیر اعظم ہاؤس واپس پہنچے تو انہیں ان کے کزن کا فون آیا کہ مجھے واپسی پر راستے میں جگہ جگہ فوجی نظر آئے ہیں۔ بھٹو نے جنرل ضیاء الحق اور دوسرے جرنیلوں کو فون کیے‘ لیکن کسی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ بھٹو سمجھ گئے کہ سب جی ایچ کیو میں جمع ہیں اور پھر واقعتاً لائن کٹ گئی۔ صبح بھٹو نے ضیاء الحق کو فون کیا تو انہوں نے کہا: ”سر مجبوری تھی۔ حالات بہت خراب تھے۔ آپ بتایئے کہاں رہنا پسند فرمائیں گے؟“ یوں یہ جمہوری دور بھی اسلحہ کے زور پر ختم ہو گیا۔

بھٹو کو مری منتقل کر دیا گیا۔ وہاں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق سابق وزیر اعظم بھٹو کو ملنے گئے۔ جو تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں‘ ان سے یوں دکھائی دیتا تھا کہ بھٹو ابھی بھی حکمران ہیں اور ضیاء الحق ان کے اسیر ہیں۔ بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ بھٹو مستقل طور پر اظہار برہمی کرتے رہے جبکہ ضیاء الحق حاکم ہو کر بھی نرم خو اور ملائم رہے۔ آخر کار بھٹو کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے ۹۰ دن میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ مختلف قرآنی آیات کا حوالہ دے کر انتخابات کرانے کے وعدوں کا اعادہ کرتے رہے۔ اس طرح گیارہ سال گزر گئے‘ یہاں تک کہ طیارے کا حادثہ ہو گیا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ دراصل بھٹو کو برطرف کر کے ضیاء الحق کو لانے میں سی آئی اے کا کردار تھا اور شنید یہ ہے کہ ان کے طیارے کے حادثے میں بھی امریکہ ہی ملوث تھا۔ صدر غلام اسحاق خان

اور نائب آرمی چیف نے بیچاری جمہوریت کو بحال کر دیا‘ لیکن جلد ہی جمہوریت کی گاڑی کو ایک مرتبہ پھر حادثہ پیش آ گیا۔

نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو سری لنکا سے پاکستان واپس آتے ہوئے ہوائی سفر کے دوران برخاست کر دیا۔ اصولی طور پر ملک کے وزیراعظم کی حیثیت سے یہ ان کا حق تھا۔ جنرل پرویز مشرف اور ان کے ساتھیوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے غدر قرار دیا۔ نواز شریف کے خلاف اقدام کرتے ہوئے انہیں گرفتار کر لیا اور خود اقتدار سنبھال لیا۔ یوں جمہوریت کی ناؤ ایک بار پھر طاقت کے بہتے دریا میں ڈوب گئی۔ جنرل مشرف نے نہ اپنے اس قدم کو مارشل لاء کا نام دیا اور نہ ہی خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہلائے بلکہ اپنے اِس منصب کے لیے CE یعنی چیف ایگزیکٹو کا نام پسند کیا۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ ہر مارشل لاء میں اقتدار کو مختلف نام اور مختلف انداز سے اپنایا گیا۔ ایوب خان اور یحییٰ خان نے سابقہ آئین منسوخ کر کے اپنی اپنی طرف سے قوم کو نئے آئین دیے۔ جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۳ء کے آئین کو مکمل طور پر منسوخ نہیں کیا بلکہ اس کی وہ شقیں معطل کر دیں جو اقتدار میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ جنرل پرویز مشرف نے عدالت کے ذریعے ایک فرد کی حیثیت سے اختیار حاصل کر لیا کہ وہ جب چاہیں آئین میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ماضی میں عدلیہ نے آئین اور جمہوریت کے بجائے ہمیشہ مارشل لاء لگانے والوں کا ساتھ دیا۔

البتہ یہ اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ بہرحال عدلیہ کا جیسا تیسا کوئی وجود تھا۔ آج عام شہریوں کے ساتھ عدلیہ بھی عدل ڈھونڈ رہی ہے۔ بالائی عدالتوں کے کئی جج خود حصولِ عدل کے لیے در بدر ہو رہے ہیں‘ لیکن عدل عنقا ہے۔ عدلیہ کو مکمل طور پر انتظامیہ کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ ججز کے تبادلے ایک عدالت سے دوسری عدالت میں اس طرح ہو رہے ہیں جیسے کلرکوں کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ امریکہ اپنے صدر ٹرمپ کی نامعقول حرکات کی وجہ سے ہرگز اس قابل نہیں رہا کہ جمہوری اقدار کے حوالے سے اس کی مثال دی جائے لیکن اس کے باوجود ابھی تک یہ صورت حال ہے کہ جج کی ٹرانسفر تو بڑی دور کی بات ہے‘ امریکہ کی فیڈرل کورٹ کے جج کی ریٹائرمنٹ کی کوئی عمر نہیں ہوتی تاکہ وہ کسی نوع کے دباؤ میں نہ آئے۔ اپنی آزاد مرضی اور آزاد ذہن سے

فیصلے کر سکے۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات جنرل مشرف کے سربراہ حکومت و ریاست بن جانے کی ہو رہی تھی۔ حکومتی سربراہ بننے کے ساتھ اب آئین سازی اور قانون سازی بھی ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھی‘ یعنی اختیارات کے گھنٹہ گھر میں ہر طرف وہ ہی وہ تھے۔ جب ان کا جی چاہا‘ انہوں نے صدر رفیق تارڑ کو اٹھا کر ایوان صدر سے باہر پھینک دیا اور خود پاکستان کے صدر بن گئے۔ جنرل مشرف کے دور میں نائن الیون ہوا‘ جب امریکہ کے صدر بش نے دنیا کو ان الفاظ میں دھمکی دی تھی:

*Either you are with us or against us.*

یعنی ہر ملک کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ ہمارے یعنی امریکہ کے ساتھ ہے‘ وگرنہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ امریکہ کے خلاف ہے۔ امریکہ نے افغانستان کے خلاف کارروائی کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی اور پاکستان افغانستان کا ہمسایہ ہے۔ امریکہ نے صدر مشرف کے سامنے سات مطالبات رکھے اس توقع کے ساتھ کہ کچھ مطالبات تو تسلیم کر ہی لیے جائیں گے۔ امریکی انتظامیہ اس وقت ششدر رہ گئی جب صدر مشرف نے تمام مطالبات تسلیم کر لیے۔ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی حقیقی جمہوریت ہوتی اور عوام کی حقیقی نمائندہ پارلیمنٹ ہوتی تو امریکہ یوں ایک ٹیلی فون کال پر اپنے مطالبات تسلیم نہیں کروا سکتا تھا۔

جمہوری اداروں اور عوام کے ووٹوں سے بننے والی حکومت کو بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ عوامی حکومت کے فیصلے طویل مشاورت کے بعد ہوتے ہیں۔ حکومت ان عوام کو جواب دہ ہوتی ہے جن کے ووٹوں سے وہ وجود میں آئی ہوتی ہے۔ ملک کی سیاست میں ان کی بقا عوامی خواہشات کے تابع ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر جمہوری حکومت عوام کے مفاد میں فیصلے کرنے کی پابند ہوتی ہے‘ وگرنہ اگلے الیکشن میں عوام انہیں مسترد کر دیتے ہیں۔ گویا ریاست اور عوام کے مفادات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جمہوریت کوئی مثالی طرزِ حکومت ہے۔ درحقیقت ہم اس تحریر میں آمریت اور مطلق العنانی سے جمہوریت کا تقابل کر رہے ہیں۔ آج دنیا میں جو طرز ہائے حکومت موجود ہیں ان میں جمہوریت اگرچہ بہتر ہے‘ وگرنہ یہ اس نظام خلافت کے سامنے ہیچ اور انتہائی حقیر ہے جس میں عوام کی رائے اور ان کے مفادات ریاست کی اولین ترجیح ہوتے ہیں۔ پاکستان میں خاص طور پر مذہبی جماعتوں اور اُن کے کارکنوں کے قلوب و

اذہان میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ جمہوریت ہر صورت ایک غیر اسلامی طرز حکومت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام میں کوئی معین نظام حکومت نہیں دیا گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک عمومی بات کی ہے کہ مسلمان اپنے معاملات مشاورت سے طے کریں۔ کوئی طرزِ حکومت کفر نہیں ہے، اگر اس کے آئین اور قانون کی تمام شِقات بلا استثناء شریعت کے دائرے میں ہیں۔ تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر امریکہ کے آئین میں بھی یہ شق شامل کر دی جائے کہ قانون سازی صرف اور صرف اسلامی شریعت کے دائرے میں رہ کر کی جائے گی تو امریکی نظام حکومت بھی قابلِ قبول ہو جائے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ احکامات جو نبی اکرم ﷺ کے ذریعے انسانیت تک پہنچے، انہیں مِن وعن قبول کرنا ہوگا۔ اگر ان کی بنیاد پر ریاستی ڈھانچا کھڑا ہوگا تو اہل ایمان کے لیے ہر طرزِ حکومت قابلِ قبول ہے، چاہے اس کا کوئی بھی نام رکھ لیا جائے۔ یہ تصور بھی غلط ہے کہ اسلامی حکومت میں عوام کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ حکومت میں حج کے دوران طواف کر رہے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ کچھ لوگ مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کے بعد فلاں شخص کو خلیفہ بنالیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میں ابھی خطبہ دیتا ہوں کہ یہ عوام کا حق ہے کہ کون ان کا خلیفہ بنے۔ آپ کو مشورہ دیا گیا کہ آپ مدینہ واپس جا کر لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کریں۔ چنانچہ آپ نے مشورہ قبول کر کے ایسا ہی کیا۔ گویا آم کھانے سے غرض ہے، پیڑ گننے سے نہیں۔ مسلمان ملک کا آئین اور قانون ہی نہیں بلکہ مکمل ڈھانچا بھی اللہ تعالیٰ کی اس شریعت کے مطابق ہو جو نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچی۔ لہٰذا مسئلہ ہرگز یہ نہیں کہ طرزِ حکومت کا نام کیا ہو۔ جو بھی ہو، اس میں شریعت اسلامی کی بالادستی ہو۔ ہمارے اسلاف کے ہاں اس کا نام خلافت تھا تو یہی خوب صورت نام اپنا لینا چاہیے۔ دنیا کو یہ ناگوار ہوتو ہو، ہم اسلام کے بنیادی اصولوں پر گامزن رہ کر ذاتی اور اجتماعی زندگی گزاریں گے۔ مسلمانوں کو ''بنیاد پرست'' کہلانے پر فخر ہے، اور رہے گا۔ ان شاء اللہ! ❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

# اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق

احمد علی محمودی

اسلام ایک عالمگیر دین، مکمل ضابطہ حیات اور پُر امن مذہب ہے۔ یہ نہ صرف نظریاتی بلکہ عملی طور پر بھی رواداری، انصاف اور انسانی احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی اسلام کا اصل پیغام ہے۔ اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق محض کاغذ تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ غیر مسلموں کے لیے ''ذمی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے: ''وہ لوگ جن کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے لی ہے۔'' یہ لفظ ہی اپنے اندر احترام اور تحفظ کا ایک سمندر رکھتا ہے۔ اسلامی فقہ میں غیر مسلم شہریوں کو ''معاہد'' بھی کہا جاتا ہے۔

## جان و مال کا تحفظ

اسلامی قانون کے مطابق ایک غیر مسلم کی جان و مال اتنی ہی محترم ہے جتنی ایک مسلمان کی۔ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم شہری کو قتل کر دے، تو قصاص میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ (الانعام:۱۵۱)

''اور کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے اللہ نے حرمت دی ہے۔''

یہ حکم عام ہے اور اس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں سے جزیہ لیا جاتا ہے، جس کے بدلے میں انہیں مکمل ریاستی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا تُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا)) (صحيح البخاري:۳۱۶۶)

''جس نے کسی معاہد کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے سونگھی جاسکتی ہے۔''

## مذہبی آزادی

اسلام غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ قرآن حکیم کا واضح اعلان ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرہ:۲۵۶) ''دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔'' غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہیں بنانے' ان میں عبادت کرنے' اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے کا مکمل حق حاصل ہے' بشرطیکہ وہ معاشرتی امن کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ان عبادت گاہوں کو مسمار کرنے یا ان کی توہین کرنے کی ممانعت ہے۔

## معاشی حقوق

غیر مسلموں کو اسلامی ریاست کی معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے' تجارت' روزگار' صنعت اور زراعت کے وہی حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے خود غیر مسلموں سے لین دین فرمایا اور ان کے ساتھ معاملات میں دیانت داری کی بہترین مثال قائم کی۔ غیر مسلم اپنی جائیداد خریدنے اور بیچنے کے مالک ہیں۔ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ اخلاق' ہمدردی اور مروت سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ⑧﴾ (الممتحنة)

''اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے کبھی جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ کوئی بھلائی کرو یا انصاف کا معاملہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اگر کوئی غیر مسلم بوڑھا یا معذور ہو جائے اور کمانے کے قابل نہ رہے تو بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا۔ آپؓ نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ جزیہ کی ادائیگی اور بڑھاپے کی وجہ سے مجبور ہوں۔ حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لائے' کھانا کھلایا اور بیت المال کے خازن کو حکم دیا: ''اس پر اور اس جیسے دیگر لوگوں پر رحم کرو۔ خدا کی قسم! یہ انصاف نہیں کہ ہم ان کی جوانی میں تو ان سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔'' اس کے بعد تمام معذور اور بوڑھے غیر مسلموں کے لیے سرکاری وظائف مقرر کر دیے گئے۔

## عدل وانصاف کی فراہمی

اسلام میں عدل وانصاف کا معیار مذہب کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾ (المائدۃ)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ‘ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے منحرف ہو جاؤ۔ عدل سے کام لو‘ یہی قریب تر ہے تقویٰ کے‘ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔‘‘

اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو اس کے خلاف بھی قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جہاں قاضی نے ایک غیر مسلم کے حق میں خلیفۂ وقت کے خلاف فیصلہ سنایا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران آپؓ کی ایک قیمتی زرہ گم ہوگئی‘ جو ایک یہودی کے پاس سے ملی۔ خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود آپؓ نے اُس سے اپنی زرہ زبردستی نہیں لی‘ بلکہ عدالت میں مقدمہ پیش کیا۔ قاضی شریح نے خلیفہ سے گواہ مانگے۔ خلیفہ کے پاس گواہ کے طور پر صرف ان کے صاحب زادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور غلام قنبر تھے۔ قاضی نے بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فیصلہ خلیفہ کے خلاف اور یہودی کے حق میں دے دیا گیا۔ اس عدل وانصاف سے متاثر ہو کر وہ یہودی فوراً مسلمان ہو گیا اور اعتراف کیا کہ یہ زرہ واقعی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے۔

## میثاقِ مدینہ

ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں اور مدینہ کے یہود و دیگر قبائل کے درمیان ایک تحریری معاہدہ کیا‘ جسے ’’میثاقِ مدینہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور مانا جاتا ہے۔ اس میں طے پایا کہ ’’یہودیوں کو ان کا دین مبارک اور مسلمانوں کو ان کا دین۔‘‘ یعنی ہر گروہ کو اپنے عقیدے پر عمل کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ غیر مسلموں کو مسلمانوں

کے برابر شہری تسلیم کیا گیا اور یہ طے پایا کہ اگر کوئی باہر سے مدینہ پر حملہ کرے گا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی‘ خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ کسی مجرم کو اس کے مذہب کی بنا پر رعایت نہیں ملے گی۔

## دورِ فاروقی

جب بیت المقدس فتح ہوا‘ تو حضرت عمر فاروق ؓ نے عیسائیوں کو ایک امان نامہ لکھ کر دیا جس میں واضح تھا کہ: ’’ان کے گرجا گھروں کو منہدم نہیں کیا جائے گا‘ نہ ان میں رہائش اختیار کی جائے گی اور نہ ہی ان کی صلیبوں یا مال و متاع میں کوئی کمی کی جائے گی۔‘‘ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس کے چرچ (کلیسائے قیامت) میں موجود تھے اور نماز کا وقت ہوا تو پادری نے آپؓ کو وہیں نماز پڑھنے کی دعوت دی۔ آپؓ نے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ ’’اگر مَیں نے یہاں نماز پڑھی تو کل کو مسلمان اسے دلیل بنا کر اس جگہ پر مسجد بنالیں گے اور تمہارا حق چھن جائے گا۔‘‘ چنانچہ آپؓ نے چرچ سے باہر نکل کر نماز ادا کی۔

مصر کے فاتح حضرت عمرو بن العاص ؓ کے دورِ گورنری میں ایک مسلمان نے ایک قبطی کے بیٹے کو مارا۔ اس قبطی نے مدینہ جا کر حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ خلیفہ وقت نے گورنر اور ان کے بیٹے کو طلب کیا اور قبطی کے بیٹے سے کہا کہ وہ بدلہ میں گورنر کے بیٹے کو مارے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ’’تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا‘ حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا!‘‘

## خلافتِ عباسیہ

مسلمانوں نے جب اندلس (اسپین) پر حکومت کی تو وہ دور غیر مسلموں (خصوصاً یہودیوں اور عیسائیوں) کے لیے ’’سنہری دور‘‘ کہلاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب یورپ کے دیگر حصوں میں یہودیوں پر ظلم ہو رہا تھا‘ تو اندلس کے مسلم حکمرانوں نے انہیں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔ مثلاً حسدائی بن شپروط ایک یہودی عالم‘ طبیب اور سفیر تھے جو قرطبہ کے خلیفہ عبدالرحمٰن سوم کے مشیرِ خاص اور وزیر رہے۔ قرطبہ اور غرناطہ کی لائبریریوں میں مسلم‘ عیسائی اور یہودی علماء مل کر تحقیق کرتے تھے۔ عیسائیوں کو اپنے تعلیمی ادارے کھولنے کی مکمل آزادی تھی۔ خلیفہ

ہارون الرشید اور مامون الرشید کے دور میں جب ’’بیت الحکمت‘‘(House of Wisdom) قائم ہوا‘ تو یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ حنین بن اسحاق ایک مسیحی طبیب اور عالم تھے‘ جنہیں خلیفہ نے بیت الحکمت کا سربراہ مقرر کیا۔ خلیفہ انہیں کتابوں کے وزن کے برابر سونا تول کر دیا کرتے تھے۔ اسلام نے مذہب کو کبھی علم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

فقہ اسلامی کے عظیم امام ابوحنیفہؒ کا نظریہ غیر مسلموں کے بارے میں بہت بلند تھا۔ ان کا مشہور فتویٰ تھا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم (ذمی) کو قتل کرے گا‘ تو اس کے بدلے مسلمان کو بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ انہوں نے انسانی جان کی حرمت کو مذہب سے بالاتر رکھا۔

اُموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (جنہیں پانچواں خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے) کے پاس دِمشق کے عیسائیوں نے شکایت کی کہ پچھلے حکمران نے ان کے ایک گرجے کی زمین چھین کر مسجد میں شامل کر لی ہے۔ آپؒ نے فوری حکم جاری کیا کہ مسجد کا وہ حصہ گرا دیا جائے اور زمین عیسائیوں کو واپس کر دی جائے۔ یہ انصاف دیکھ کر عیسائی اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے خود وہ زمین مسجد کے لیے وقف کر دی۔

یہ تمام واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اسلام نے غیر مسلموں کو صرف برداشت (tolerate) ہی نہیں کیا‘ بلکہ انہیں اپنی زبان‘ ثقافت اور مذہب کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی گئی۔

## موجودہ دور کے انسانی حقوق

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج دنیا ’’انسانی حقوق کے عالمی منشور‘‘ کی صورت میں جو کچھ دیکھ رہی ہے‘ اسلام نے وہ سب ۱۴۰۰ سال پہلے ہی عملی طور پر نافذ کر دیا تھا۔ کچھ اہم پہلو اور موازنہ پیش خدمت ہے۔

آج اقلیتوں کے حقوق کی بات تو بہت کی جاتی ہے‘ لیکن عملاً کئی جگہوں پر انہیں امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ اسلام نے غیر مسلموں کو ان کے اپنے ’’پرسنل لاء‘‘ کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیا۔ نکاح‘ طلاق اور وراثت کے فیصلے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ہوتے تھے‘ جن پر اسلامی قانون مسلط نہیں کیا جاتا تھا۔

## امام اوزاعیؒ کا تاریخی واقعہ

ایک مرتبہ شام کے گورنر نے کچھ غیر مسلموں کو ان میں سے بعض کی کسی خطا پر جلاوطن کر دیا۔ اس دور کے مشہور عالم امام اوزاعیؒ نے گورنر کو ایک سخت خط لکھا' جس میں انہوں نے قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیا: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ ''کسی بوجھ اٹھانے والے پر دوسرے کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔'' اگر چند افراد نے غلطی کی ہے تو تم پوری بستی کو سزا نہیں دے سکتے۔ ان کی مداخلت پر گورنر کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا اور ان غیر مسلموں کو ان کے گھروں میں دوبارہ بسایا گیا۔

## دورانِ جنگ غیر مسلموں کے حقوق

اسلامی جنگی قوانین اس قدر منظم تھے کہ دشمن کے حقوق کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے واضح احکامات تھے کہ عبادت گاہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے۔ درختوں کو نہ کاٹا جائے اور فصلوں کو تباہ نہ کیا جائے۔ یہ وہ حقوق ہیں جو اس دور کے ''جنیوا کنونشن'' میں شامل کیے گئے ہیں۔

## شہریت اور مساوی حقوق

جدید ریاستوں میں عمرانی معاہدہ کی بات کی جاتی ہے۔ اگر آج کی ریاستیں میثاقِ مدینہ کے اصولوں کو اپنائیں' تو اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے کا تصور ختم ہو جائے گا اور انہیں مساویانہ حقوق حاصل ہوں گے۔

## مقدّسات کا احترام

مختلف مذاہب کے درمیان ٹکراؤ کی ایک بڑی وجہ ایک دوسرے کے مقدسات (مقدس ہستیوں اور کتابوں) کی توہین ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (الانعام:۱۰۸) ''اور مت گالیاں دو (یا مت برا بھلا کہو) ان (کے معبودوں) کو جنہیں یہ پکارتے ہیں اللہ کے سوا۔'' آج اگر بین الاقوامی سطح پر اس اصول کو اپنا لیا جائے کہ کسی کے مذہب کی توہین '' آزادیٔ اظہارِ رائے'' نہیں بلکہ ''صریحاً جرم'' ہے تو دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

## عبادت گاہوں کا تحفظ

موجودہ دور میں انتہا پسندی کی وجہ سے اکثر عبادت گاہوں پر حملے کیے جاتے ہیں۔ مسلم معاشروں میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ یہی طرزِ عمل غیر مسلموں کو بھی اپنانا چاہیے۔

## معاشی وسماجی انصاف

آج دنیا میں اکثر اقلیتیں غربت اور معاشی پس ماندگی کا شکار ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے غیر مسلموں کے وظائف مقرر کیے۔ اسلامی فلاحی ریاست کے تصور کے تحت زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات اور سرکاری فنڈز سے غیر مسلم حاجت مندوں کی مدد کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر یہی طرزِ عمل غیر مسلم ریاستوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں' اپنالیا جائے تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔

## مکالمہ اور رواداری

آج ''تہذیبوں کے تصادم'' (clash of civilizations) کی بات کی جاتی ہے' جبکہ اسلام ''تہذیبوں کے مکالمے'' پر زور دیتا ہے۔ قرآن مجید اہلِ کتاب کو ''کَلِمَةٍ سَوَآءٍ'' (مشترک بات) کی طرف بلاتا ہے۔ آج ہمیں بحث ومباحثے کے بجائے مشترکہ اقدار (جیسے انسانیت کی خدمت' سچائی اور انصاف) پر مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

## حاصلِ کلام

آج کے دور میں اسلام کے اصولوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے ہمیں تعلیم وتربیت اور عملی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو یہ احساس کرنا ہوگا کہ غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ محض ایک سیاسی ضرورت نہیں' بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنے ہاں رہنے والی اقلیتوں کو ایسا مثالی ماحول دیں کہ دنیا ان کے عدل کی مثالیں پیش کرے۔ اس حوالے سے اگر میڈیا مثبت کردار ادا کرے تو اس سے معاشرے میں بہت بہتری آسکتی ہے۔ یاد رہے کہ امن اور خوش حالی صرف ہتھیاروں سے نہیں' بلکہ ذہن کی آبیاری سے حاصل ہوتی ہے۔

# توکّل کی صحیح تعبیر

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

قرآن مجید میں صبر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (آل عمران) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' گویا صبر کرنا فضائل اخلاق میں سے ہے۔ اسی طرح توکّل کی صفت بھی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ (آل عمران) ''بے شک اللہ تعالیٰ توکّل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' توکّل کی صفت کا قرآن مجید میں بار بار ذکر ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کو توکّل کرنے کا حکم ہے: ﴿وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (الاحزاب) ''اللہ پر توکّل کرو' اور اللہ تمہارے لیے بطور وکیل (کارساز) کافی ہے۔'' اسی طرح توکّل کو اہل ایمان کی صفت کہا گیا ہے: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (المائدۃ) ''اگر تم ایمان والے ہو تو بس اللہ ہی پر بھروسا رکھو۔''

توکّل یہ ہے انسان کا بھروسا اللہ تعالیٰ ہی پر ہو۔ کوئی کام کرنا ہو تو اس بات پر پورا یقین ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تو یہ کام انجام پائے گا' ورنہ ہزار انتظام ہوں تو وہ بھی ناکام ہو جائیں گے۔ توکّل کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو کام مقصود ہو اُس کی انجام دہی کے لیے ضروری لوازمات' وسائل یا اقدامات میسر کر لیے جائیں مگر ان پر بھروسا نہ ہو۔ بھروسا ہو تو صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ہو' کیونکہ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے۔ توکّل کی باطل تعبیر یہ ہے کہ جب ہونا وہی ہے جو اللہ نے کرنا ہے تو وسائل اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ درحقیقت توکّل وسائل جمع کرنے کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ کلی طور پر وسائل ہی پر بھروسا کرنے سے روکتا ہے۔ وسائل تب ہی کام آئیں گے اگر اللہ چاہے گا۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! میں اپنی اونٹنی کو

باندھوں اور توکّل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور توکّل کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ)) (سنن الترمذی: ۲۵۱۷) ’’اس کو باندھو اور توکّل کرو۔‘‘ احتیاط اور احتراز توکّل کے خلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ کوئی اہم کام ہو تو اپنے اصحاب کے مشورے کی روشنی میں فیصلہ کیجیے اور جب فیصلہ کر چکیں تو اللہ پر توکّل کریں اور تذبذب میں نہ پڑیں۔ توکّل یہ ہے کہ جس کام کی وسعت اور طاقت نہیں اس کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے۔ آپ ﷺ نے عین جنگ کے دوران نماز پڑھی تو سامانِ جنگ کی حفاظت کا بھی انتظام کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر ملی کہ انہیں گرفتار کرنے کا مشورہ ہو رہا ہے تو آپؑ شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے بارے میں تدبیر سوچنے والوں کا خوف ہوا تو آپؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے نکل کر غارِ ثور میں روپوش ہو گئے۔ کسی موذی جانور کے خوف سے غار کے تمام سوراخ بند کر دیے مبادا کوئی سانپ بچھو نہ ڈس لے۔ اس طرح انہوں نے اپنے بچاؤ کے لیے ممکن اقدام کر لیے۔ ایسا نہ ہوا کہ آپ ﷺ نے بس اللہ پر توکّل کیا اور اپنی حفاظت کے اقدام کو غیر اہم سمجھا۔

ترکِ اسباب کا سبق تو شیطان کی طرف سے ہوتا ہے جو انسان کو گمراہ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا۔ ایک شخص نے ابوعبداللہ بن سالم سے سوال کیا کہ: ہم کسب کو عبادت سمجھیں یا توکّل کو؟ انہوں نے جواب دیا کہ توکّل رسول اللہ ﷺ کا حال ہے اور کسب آپؐ کی سُنّت۔ کسب توکّل کے منافی نہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ یہی ہے کہ کسب بھی کرتے اور توکّل اللہ پر رکھتے۔ حضرت آدم علیہ السلام کاشت کاری کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کپڑے سیتے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام سوداگر تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے زرہیں بناتے اور ان کی قیمت سے گزر بسر کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام اور ہمارے رسول اللہ ﷺ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اسی طرح باقی انبیاء بھی کسی نہ کسی پیشے سے روزی کماتے تھے۔ معلوم ہوا کہ کسب توکّل کے خلاف نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بھی کسی نہ کسی پیشے کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ حضرات ابوبکر، عثمان، عبدالرحمٰن، طلحہ رضی اللہ عنہم کپڑے بیچتے تھے۔ حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تیر بناتے تھے۔ اسی طرح تمام تابعین اور ان کے بعد والے ہمیشہ کسب کرتے رہے

اور اسی کا حکم دیتے رہے۔

جو شخص اپنے اعضاء و جوارح سے کام نہ کرے تو وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کے بال بچے کہاں سے کھائیں گے؟ یقیناً وہ دوسروں کا محتاج ہوگا اور اسے لوگوں کی خیرات پر گزارا کرنا پڑے گا‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمان سے ضرورت کی چیزیں نہیں پھینکتا۔ اگر لوگ کسب چھوڑ دیں تو زندگی ہی ختم ہو جائے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنی غربت بیان کی تو آپ ﷺ نے اسے جنگل سے لکڑیاں لا کر اور انہیں بیچ کر اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پوری کرنے کو کہا۔ اللہ نے انسان کو ہاتھ پیر دیے ہیں کہ ان کے ساتھ محنت کر کے روزی کمائے اور اللہ تعالیٰ پر توکّل کرے۔

صدقہ خیرات کرنے کی بڑی فضیلت ہے لیکن یہ اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو کسب کر کے کماتا ہے۔ اپنی اور بال بچوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اور کچھ بچا بھی لیتا ہے جس سے حاجت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ اگر وہ خود بھیک مانگ کر گزارا کرتا ہے تو وہ دوسروں کی مدد کا ثواب کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ جو لوگ کسب کرنے کو توکّل کے خلاف سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو پہلے سے لکھا ہوا ہے اور وہ ہو کر رہے گا‘ پھر احتیاطیں کرنے اور اسباب اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے! وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تقدیر پر بھروسا کر کے بیٹھ رہنا درست نہیں‘ کیونکہ کسی شخص کو نہیں معلوم کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اگر انسان اپنی کامیابی کے لیے محنت کرتا ہے اور اپنا مدّعا حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کرتا ہے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ گویا یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا‘ وہ مسبّب الاسباب ہے۔ بندہ جو اسباب اختیار کرتا ہے‘ اللہ تعالیٰ ان کی قدر کرتا ہے۔ وہ ان کو قبول کرتا ہے یا نامقبول‘ یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے جو یقیناً صحیح ہوتا ہے چاہے انسان اس کی حکمت کو سمجھ سکے یا نہ سمجھ پائے۔

بھوکا شخص بھوک مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ و زاری کرے لیکن اس کے لیے دوڑ دھوپ نہ کرے تو وہ زیرک نہیں‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رزقِ حلال کمانے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔ وہ سب کسب کے ذریعہ کماتے تھے۔ کسی نے بھی ایسا توکّل نہیں کیا کہ وہ اسباب اختیار نہ کرنے کو فضیلت کا باعث سمجھتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: ((اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی)) (صحیح مسلم: ۲۳۸۵) ’’اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔‘‘ اوپر والا ہاتھ دینے والا ہے جس نے اسباب اختیار کر کے روزی کمائی۔ نہ صرف اپنی حاجت پوری کی بلکہ ناداروں اور محتاجوں کی مدد بھی کی۔

اگر کوئی شخص مچھلیاں پکڑنے والے پر نکیر کرتا ہے کہ وہ اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے جانداروں کو پکڑتا ہے حالانکہ وہ جاندار اللہ کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں‘ گویا شکاری نے اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے مخلوق کو اللہ کے ذکر سے روک دیا‘ تو پھر گھاس کاٹنا بھی درست نہیں کہ گھاس کا تنکا تنکا اللہ کا ذکر کرتا ہے۔

اپنی مباح ضرورت کے لیے جائز اسباب اختیار کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ اللہ کا حکم بھی یہی ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ اپنا کام نکالنے کے لیے ممنوع ذرائع اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ سراسر توکّل کے خلاف ہے۔

❁❁❁

## بقیہ: مفتی طارق مسعود اور شجاع الدین شیخ کا مکالمہ

کیا پاکستان سے باہر بھی تنظیم کا کوئی سلسلہ ہے؟ شجاع الدین شیخ نے بتایا کہ فی الحال ان کا فوکس پاکستان پر ہے جہاں وہ پیدا ہوئے اور جو اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے۔ اگر ایک جگہ خلافت کا نظام قائم ہو جائے تو اس کا اثر خود بخود پھیلے گا۔ البتہ جو پاکستانی بیرون ملک جڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ایک حد تک مختلف علاقوں میں نظم موجود ہے۔

آخر میں مفتی طارق مسعود نے شجاع الدین شیخ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مجلس بہت مفید رہی۔ شجاع الدین شیخ نے مفتی صاحب کی وسعتِ قلبی اور محبت کو سراہا کہ انہوں نے اپنا یہ پورا پروگرام تنظیم اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حوالے سے کیا ہے۔ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مدارس اور عصری تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان رابطے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ دین کی خدمت بڑے پیمانے پر ہو سکے۔

(تشکّر: مجلّہ الشریعہ‘ اپریل ۲۰۲۶ء)

❁❁❁

PHARMA

# Your Health
# Our Devotion

## NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com

June 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.6

Monthly Meesaq Lahore